JULY
2025

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

جناب خورشید رضوی، محترمہ درخشندہ نوید

جناب اعجاز رضوی، جناب نجیب احمد،
محترمہ بیگم احمد بشیر، محترمہ درخشندہ نوید

محترمہ درخشندہ نوید، محترمہ صغریٰ صدف اور دیگر

محترمہ درخشندہ نوید اپنے دوست احباب کے ساتھ

محترمہ درخشندہ نوید، جناب سعادت سعید،
جناب راجہ صادق، جناب شرجیل انظر

جناب زاہد مسعود، جناب شاہین عباس، جناب قمر رضا شہزاد،
جناب شہزاد بیگ، محترمہ درخشندہ نوید اور دیگر

بانی مدیر خالد احمد

غزل

کیا قریۂ جاں، کیا مامنِ غم، اک آن میں کیا کیا بیٹھ رہے
اک درد غبار مثال اٹھے، ہر بادیہ پیما بیٹھ رہے

ہر بانس ہوا کا ساتھ رہا، ہاتھوں میں ہوا کا ہاتھ رہا
جب ہاتھ ہوا نے کھینچ لیا، آوارۂ صحرا بیٹھ رہے

یہ شہر کہیں وہی گاؤں نہ ہو، یہ پیڑ کہیں وہی چھاؤں نہ ہو
اک روپ کی دھوپ میں دیکھ کے ہم اک رنگ کا سایا بیٹھ رہے

کب ہاتھ سے آس کا تار گیا، دل چیخ پکار کے ہار گیا
تم بھی سرِ ساحل بیٹھ رہے، ہم بھی تہِ دریا بیٹھ رہے

کیا تم کو خبر اے سنگ شکن در آئی بدن میں کیسی تھکن
اے موجِ الم، کیوں دیکھ کے ہم بام و درِ دنیا بیٹھ رہے

مر جائیں نہ ہم اے چند گرو، تم پرچمِ جام بلند کرو
اے آتشِ مے، اے تابشِ خم، کب گنبدِ مینا بیٹھ رہے

اے غازۂ قلقلِ ساغر و غم اے ہالۂ ماہِ چہار دہم
دھن دھند میں گم، کیا ہم کیا تم، سن کر یہی چرچا بیٹھ رہے

تائب کے حفیظ، ندیم کے مان، گوہر پہ نگاہ نجیب سمان
ہم لوگ پسِ دیوارِ کرم اے انجمن آرا بیٹھ رہے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL

Freight Forwarding

Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ Karachi: (021) 34541301-7 ■ Lahore: (042) 37030901-9
■ Sialkot: (052) 3554301-6 ■ Rawalpindi/Islamabad: (051) 5162704-5
■ Faisalabad: (041) 8542924 ■ Peshawar: (091) 5252311 ■ Multan: (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ
بیاض
لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 33 - جولائی 2025 - شمارہ نمبر: 7

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: بلقیس عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: رخشندہ نوید

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلو میٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلو میٹر نزد فارما سیوٹیکل اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سید ریاض حسین زیدی، سرور حسین نقشبندی، محمد افضال انجم	7 تا 9
2	نعت	جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز، نسیم سحر، محمد انیس انصاری، محمد یٰسین قمر، خالق آرزو، سرور حسین نقشبندی، نبیل احمد نبیل، محمود الحسن محمود، نوید عاجز	10 تا 22
3	سلام	سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز، نثار ترابی، انصر حسن، محمد شفیق انصاری، سرور حسین نقشبندی، محمد نوید مرزا	23 تا 29
4	دوہے/گیت	سعید اشعر، سلیم فگار	30 تا 31
5	ہائیکو	فرخندہ شمیم	32
6	رباعیات	گلزار بخاری، محمد نصیر زندہ، سعید اشعر	33 تا 35
7	گوشہ رخشندہ نوید	مضامین: کوثر محمود، اختر شمار، فاطمہ حسن، محمد حمید شاہد، ابدال بیلا، شفیق انجم	36 تا 53
		بچوں کے لیے کہانی — رخشندہ نوید	54 تا 56
		رخشندہ نوید __ مختصر آرا — خورشید رضوی، بانو قدسیہ، افتخار عارف، شعیب بن عزیز، معین نظامی	57 تا 59
		رخشندہ نوید __ ایک ادبی نوید (خاکہ) — اعجاز رضوی	60 تا 62
		شاعری — رخشندہ نوید	63 تا 70

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
8	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، جلیل عالی، اعجاز کنور راجہ، نسیم سحر، خاور اعجاز، گلزار بخاری، باقی احمد پوری، راحت سرحدی، صفدر صدیق رضی، عقیل رحمانی، مسعود احمد، محمد انیس انصاری، سعد اللہ شاہ، اقبال سروبہ، واجد امیر، سلیم فگار، اکرم ناصر، رضا اللہ حیدر، اجمل اعجاز، شریف ساجد، منظر اعجاز منظر، افتخار شاہد، افروز رضوی، افتخار الحق، احمد جلیل، ہمایوں پرویز شاہد، شوکت محمود شوکت، افضل ہزاروی، نائلہ راٹھور، شکور احسن، خالدہ انور، اکرم سحر فارانی، شمشیر حیدر، ارشد محمود ارشد، اکمل حنیف، اصغر علی بلوچ، اعجاز دانش، اوصاف شیخ، سرور فرحان، شبیر نازش، اکرم جاذب، نبیل احمد نبیل، صغیر احمد صغیر، راجہ عبدالقیوم، میتھیو محسن، بشیر احمد حبیب، قمر نیاز، شیخ اقبال، ساگر حضور پوری، علمدار حسین، کوکی گل، ساجد رضا خان، سلیم اختر، محمد اشفاق بیگ، سیدہ آیت گیلانی، عبدالروف زین، ندیم ملک، نبیل قیصر، ابن عظیم فاطمی، عابد رضا، جیا قریشی، کومل جوئیہ، اورنگزیب حسام حر، خالق آرزو، عاصم بخاری، انتظار سید، غضنفر مہدی، شہاب اللہ شہاب، اعجاز رضوی	70 تا 140
9	مضامین	جلیل عالی، خاور اعجاز، نسیم سحر، شاہد اشرف، امجد طفیل، رحمان حفیظ، افتخار الحق، ظفر اقبال ظفر، سید تحسین گیلانی، نجمہ منصور، محمود الحسن محمود، صدام ساگر، عمران حیدر تھیم، محمد حبیب اللہ، احسان اللہ طاہر، کومل شہزادی	141 تا 202
10	مائکرو فکشن	خالد نذیر، بشریٰ شیریں	203 تا 205
11	افسانے	تسنیم کوثر، آغا گل، محمد سعد	206 تا 222
12	نظمیں	خالد احمد، جلیل عالی، صفدر صدیق رضی، طالب انصاری، شیخ اقبال، مسعود احمد، سلیم فگار، ارشد محمود ارشد، ریاض ندیم نیازی، امجد بابر، ظہور چوہان، صغیر احمد صغیر، نائلہ راٹھور، آفتاب جاوید، اسعد رضا سحر، جہاں آرا تبسم، عاصم بخاری، تصدق فرید، اعجاز رضوی	223 تا 241

حمد

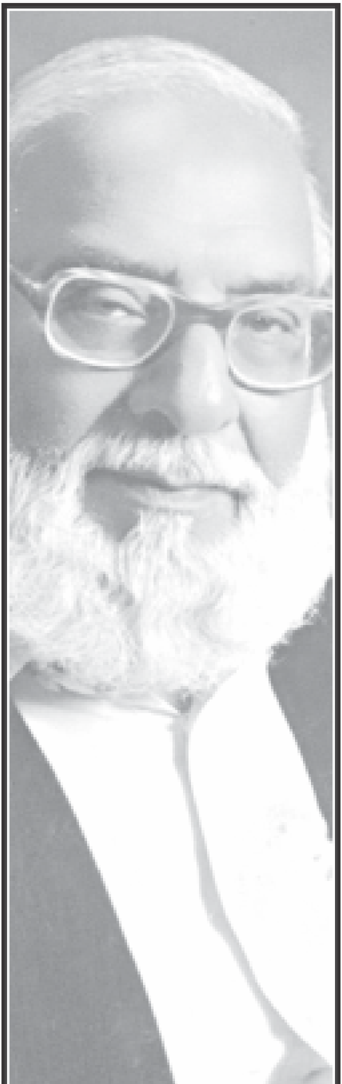

صد شکر مجھے دولت ایماں ہے میسر
یعنی مجھے اللہ کا عرفاں ہے میسر

ہر آن ترا شکر بجا لانے کی خاطر
جھکنے کو جبیں ، سجدۂ احساں ہے میسر

بے مثل ہیں وسعت میں کمالاتِ خداوند
دیکھیں تو ذرا سورۂ رحماں ہے میسر

ہر بندۂ مومن کی تڑپ اس کے لیے ہے
اللہ سے ملنے کا جو ارماں ہے میسر

ادراک معانی کی خبر اس سے ملی ہے
محبوبِ خدا ، حاملِ قرآں ہے میسر

خوش یوں تو جہاں بھر کو تری بندگی آئی
لیکن سرِفہرست یہ انساں ہے میسر

چمکا ہے ریاض آنکھ میں گلزارِ عقیدت
شادابیٔ مدحت کا جو عنواں ہے میسر

سید ریاض حسین زیدی

حمد

نفس نفس کی اذاں، کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان
یقیں ورائے گماں، کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان

دکھائی دیتا ہے جو کچھ نظر کا دھوکہ ہے
مکین ہیں نہ مکاں، کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان

ہمیشہ رہنے کا کس کو یہاں پہ دعویٰ ہے
رہا ہے کون یہاں، کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان

کھلا اسی پہ حیاتِ دوام کا عقدہ
ہوا ہے جس پہ عیاں، کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان

کرے نہ کوئی تجاوز حدود سے اپنی
رہے جو وردِ زباں، کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان

ہر ایک غم کا مداوا یہ نسخۂ اکسیر
قرارِ دیدہ و جاں، کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان

یہ تیرگی بھی ہے مہمان چند گھڑیوں کی
یہ نورِ کاہکشاں، کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان

کمالِ علم و ہنر کب ہے دائمی سرور
جمالِ حرف و بیاں کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان

سرور حسین نقشبندی

حمد

غموں کا بوجھ مرے سر سے ٹالتا وہ ہے
مری شبوں کے اندھیرے اجالتا وہ ہے

سمندروں میں سکھاتا ہے تیرنا بھی وہ
نگیں جو ڈوبے تہہ سے اچھالتا وہ ہے

کیا ہے خلق تو دیتا ہے رزق بھی سب کو
سو پتھروں میں بھی کیڑوں کو پالتا وہ ہے

بنا کے پانی سے ہر شے کو دو جہانوں میں
سبھی کو اپنے وجودوں میں ڈھالتا وہ ہے

زمیں کے سینے میں خود بیج ہم سے ڈلوا کر
زمیں کو چیر کے کونپل نکالتا وہ ہے

ہر ایک بات سے وہ باخبر ہے ہر لحظہ
وہ دیکھتا ہے سبھی کو ہی بھالتا وہ ہے

وہ زندہ قائم و دائم ہے ہر گھڑی ہر پل
خیال اپنا دلوں میں بھی ڈالتا وہ ہے

محمد افضال انجم

نعتؐ

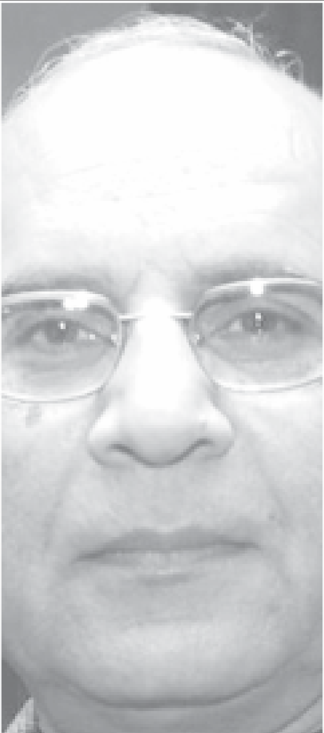

حسابِ حال کوئی صبح کا نہ شام کا ہے
اک ایک سانس ہمارا اُسیؐ کے نام کا ہے

نظر سے گم نہیں ہوتا نشانِ منزلِ خواب
یہ سب کمال فقط اس جمالِؐ تام کا ہے

جدا جدا نہیں میدانِ دین و دہر ہمیں
کہ سب جہات میں رہبر وہؐ گام گام کا ہے

قیام کرتا رہا جو حرا میں راتوں کو
شرف اسیؐ کو سرِ لامکاں خرام کا ہے

سمجھ سکے کوئی کیا منصب و مقام اُسؐ کا
ازل سے چاند جو مینارِ کُن کے بام کا ہے

دھرے ہوئے ہیں غزہ میں ہتھیلیوں پہ جو سر
جنوں جگایا ہوا اُس مہِ تمام کا ہے

کسی لکھت میں بھی عکس اُسؐ کے بھوتا نہیں ہے
مرے قلم میں یہی ایک وصف کام کا ہے

جلیل عالی

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

میرے بچوں، میرے شہروں، میرے قصبوں کا
حافظ آپؐ کے صدقے ٹھہرے ستار و غفار

نعتؐ

ہوتا ہے ادا اسم محمدؐ مرے لب سے
رکھتا ہوں جدا لذت گفتار میں سب سے

ہے عشق نبیؐ میرے رگ و ریشہ جاں میں
جھوم اٹھتی ہے یہ روح مرے کیف طرب سے

رہتے ہیں مرے دھیان میں اوصاف نبیؐ کے
تخلیق ہوئے شام و سحر ہیں مرے جب سے

کھل اٹھتے ہیں کیا کیا نہ گل تازہ بہر سو
جو نام بھی لیتا ہے ریاض ان کا ادب سے

کب چشم کرم ہوتی ہے مجھ پر مرے مولا
میں آپؐ کی رحمت کا طلبگار ہوں کب سے

مجھ پر شہ کونین کا یہ لطف و کرم ہے
محفوظ ہوں دنیا کے ہر اک سیل غضب سے

اوہام بلا خیز کی ظلمت ہوئی کافور
روشن مرے افکار ہوئے ماہ عرب سے

جذبے ملے، دھڑکن ملی، نسبت ملی ان سے
جینے کے لیے روح ملی ان کے سبب سے

محشر میں بھی ٹوٹے گا نہ ان سے مرا رشتہ
صد شکر کہ نسبت ہے مری ان کے نسب سے

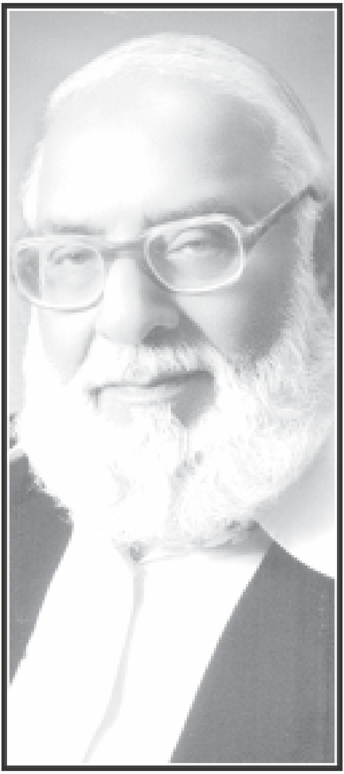

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

خاور اعجاز

جرا کا نور مری رُوح میں اُتر جائے
تو یہ سیاہ کدہ روشنی سے بھر جائے

ٹھہر گیا ہُوں فضائے مدینہ میں آ کر
یہ چاہتا ہُوں یہاں زندگی گذر جائے

مثالِ بادِ صبا چلیو رہروانِ حرم
جدھر جدھر کو مدینے کی رہگذر جائے

درِ نبیؐ پہ جو پہنچیں تو دل یہ چاہتا ہے
ہمیشہ کے لیے بندہ یہیں ٹھہر جائے

لکھی ہے نعت حبیبِ خدا کی مدحت میں
خدا کرے کہ مری عاقبت سنور جائے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پل کے پل، بس ایک جھلک، اے آقا، اے آقا!
دم کے دم، اے میرے رہبر، اے میرے سردار!

نعتؐ

کوئی درودؐ کی محفل اگر سجانے لگے
تو تشنگاں کو مئے معرفت پلانے لگے

تڑپ یہ ہوتی ہے، مَیں اُس کے ساتھ ہی چل دوں
کوئی بھی دوست مراجب مدینے جانے لگے

نبیؐ سے اپنی مودّت کا انفراد یہ ہے
"وہ یاد اَور بھی آیا جو ہم بھلانے لگے"

پیامِ امن واماں آپؐ لے کے آئے تھے
اسے سمجھنے میں دنیا کو کیوں زمانے لگے؟

بڑے دنوں سے طبیعت اداس رہتی ہے
مجھے حضورؐ کی باتیں کوئی سنانے لگے!

وہ نورِ گنبدِ خضریٰ، وہ نورِ غارِ حرا
تصوّرات میں منظر وہ جگمگانے لگے

درود پڑھتا ہوں، اُنؐ پر سلام بھیجتا ہوں
جونہی مجھے مِرے آقاؐ کی یاد آنے لگے

حضورؐ آپؐ کی سیرت کے منکرین بھی اب
گواہی دینے لگے، آیتیں سنانے لگے!

جو فلسفۂ فنا و بقا سمجھ لے کوئی
وہ ترکِ دنیا کرے، آخرت کمانے لگے

نسیم رونقِ میلادِ مصطفیٰؐ کے طفیل
نگر کے کوچہ و بازار جگمگانے لگے

نسیمِ سحر

نعتؐ

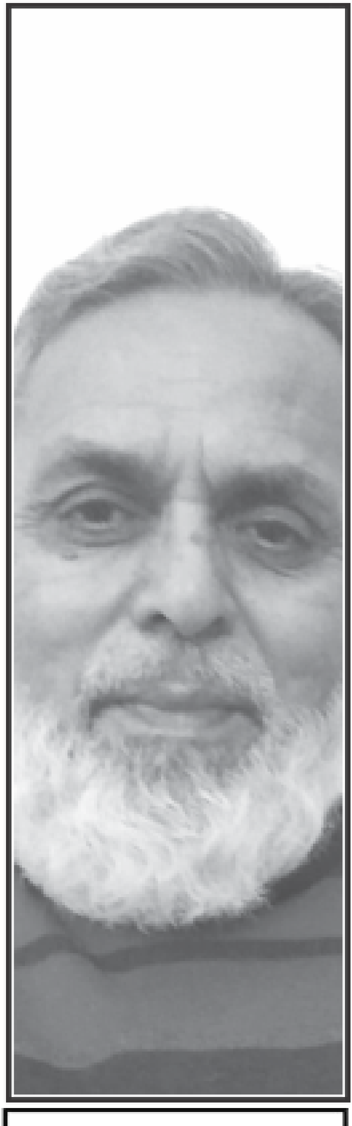

عرش سے آئی ہے صدا ، صَلِّ علیٰ محمدؐ
صلِّ علیٰ نبیّنا ، صَلِّ علیٰ محمدؐ

نہ کوئی اور ہے الٰہ، تیرے سوا، مرے خدا!
نہ کوئی اور دوسرا ، صَلِّ علیٰ محمدؐ

دل ہے قیام گہ تری، آنکھ ہے جلوہ گہ تری
سب کی زباں پہ ہے ثنا، صَلِّ علیٰ محمدؐ

نہ کوئی تجھ سا خوش ادا، نہ کوئی تجھ سا خوش نوا
نہ کوئی تجھ سا دلرُبا ، صَلِّ علیٰ محمدؐ

محفلِ نعت فرش پر ، بزمِ درود عرش پر
چاروں طرف کرم نما ، صَلِّ علیٰ محمدؐ

آپؐ کے سر پہ تاج ہے، آپؐ کے ہاتھ لاج ہے
ہر کوئی آپؐ کا گدا ، صَلِّ علیٰ محمدؐ

اے مرے شاہِ بحر و بر، راحتِ جاں، حق نظر!
تجھ پہ انیسِ جاں فدا ، صَلِّ علیٰ محمدؐ

محمد انیس انصاری

نعتؐ

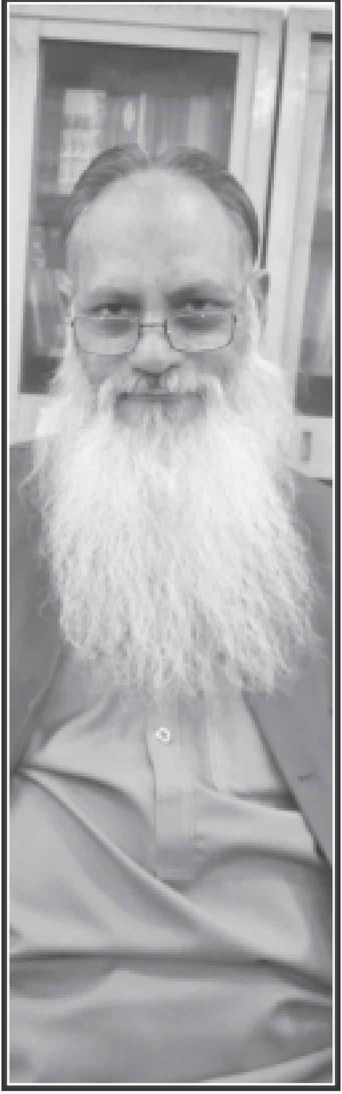

فکر و احساس و نظر پر خلد کا منظر کھلا
جب درِ لطف و عطائے شافعِ محشر کھلا

خواب آنکھوں سے جو دیکھا قریۂ خیرُالبشر
روزنِ انوار میری روح کے اندر کھلا

مل گئی دل کو رہائی قیدِ حزن وخوف سے
فخرِ موجودات کے جود و کرم کا در کھلا

دل کے اندھوں کو نظر آتی ہے کب قوسِ قزح
ہر کسی پر کب جمالِ سیرتِ اطہر کھلا

شرک و بدعت کے اندھیرے ان کے آنے سے چھٹے
سرِ وحدت ان کی ضو سے ہر زمانے پر کھلا

نعت کے صدقے معزز ہو گئے نطق ونوا
مدحِ محبوبِؐ خدا سے حرف کا جوہر کھلا

سیرت و خلقِ نبیؐ کا ترجماں قرآن ہے
راز ان کی عظمتوں کا اے قمرؔ سب پر کھلا

محمد یٰسین قمر

نعت ﷺ

نگاہوں میں تمنائے مدینہ
مرا دل بھی ہے شیدائے مدینہ

کھلے دل بھی گُل تازہ کی صورت
اگر اس میں اتر جائے مدینہ

بسی ہے آرزو اس دل میں آقا
ہو ایسا کوئی ، پہنچائے مدینہ

سفر سے آشنا ہو جاؤں یا رب
بنوں میں بھی جو گلہائے مدینہ

میں کیوں منت کہیں پر جا کے مانگوں
مرے دل میں ہیں آقائے مدینہ

ترستی ہیں مری آنکھیں بھی خالق
بلا لیں کاش مولائے مدینہ

خالق آرزو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

قصد مدح کیے بیٹھا ہے پھر خالد احمد
شان خدا ، خوشبو کے کنگن ، ڈھالے گا لوہار

نعتؐ

لف ہیں روح و جسد مدینے سے
ہے محبت اشد مدینے سے

شہر کوئی نہیں ہے دنیا میں
جس کا اونچا ہو قد مدینے سے

معتبر ہو گیا زمانے میں
جس نے پائی سند مدینے سے

اب تمہارا یہاں پہ کام نہیں
لوٹ جا اے خرد مدینے سے

میری خواہش، طلب، دعا کوئی
ہو کے آئی نہ رد مدینے سے

خاک طیبہ کی قبر میں رکھنا
یوں ملے گی لحد مدینے سے

رحمتِ حق کی شکل میں سب کو
مل رہی ہے مدد مدینے سے

لے کے آتے ہیں زائرانِ حرم
برکتیں بے عدد مدینے سے

میرے فکر و خیال کو سرور
مل رہی ہے رسد مدینے سے

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

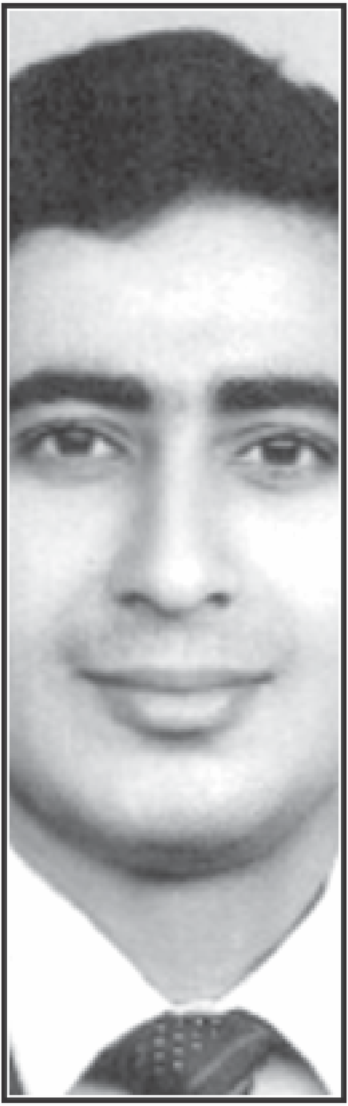

تُو ہے خیرالوریٰ، تُو ہے نُورالہدیٰ، تجھ سا کوئی نہیں
تُو ہے طٰہٰ لقب، والقمر، والضحیٰ، تجھ سا کوئی نہیں

ہر طرف جب تری ہی امامت کا شہرہ ہوا، مسجدِ قدس میں
بن گئے سب ترے مقتدی انبیا، تجھ سا کوئی نہیں

تُو وہاں تک گیا جس جگہ دوسرا کوئی پہنچا نہ تھا
تیری معراج کا کیا کہوں مرتبہ، تجھ سا کوئی نہیں

تُو زمانوں کا سردار ہے، کاروانوں کا سالار ہے
تُو ہر اک دور میں سب کا ہے رہنما، تجھ سا کوئی نہیں

آپؐ تیری مثال اور کوئی نہیں، تُو ہے اپنی مثال
تجھ سا آیا نہیں کوئی، ہرگز نہیں آئے گا، تجھ سا کوئی نہیں

میرا فکر و شعور اور یہ فہم و ادراک بس تجھ سے ہے
تُو نے مجھ کو دیا راستہ علم کا، تجھ سا کوئی نہیں

بے ہنر ہے اگرچہ نبیل، ایک تیرا ہی وصاف ہے
خاتمِ انبیا، اے حبیبِ خدا، تجھ سا کوئی نہیں

نبیل احمد نبیل

نعتؐ

سرِ تسلیم اسمٰعیلؑ نے آخر جھکانا تھا
کہ ابراہیمؑ کو اُس نے خلیل اللہ بنانا تھا

رہے گی تشنۂ تفسیر کوئی رُوحِ قربانی
کسی ایثار پر چرخِ کہن کو مسکرانا تھا

مشیت تھی کہ ابراہیمؑ معمارِ حرم ہو گا
کہ تیری آل میں ہی مرسلِ آخرؐ کو آنا تھا

یہ نقصِ جنہم اُس کا، فلسفہ سمجھا نہیں جس نے
بلا مقصد ہمیں کب جانور کا خوں بہانا تھا

فقط سُنتے رہے ہم قصہ آدابِ فرزندی
ہمیں محمود مکتب کی کرامت تک بھی جانا تھا

محمود الحسن محمود

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

ان کے ذکر کا ہالہ ٹھہرے، کیا عجز اظہار
وہ جانِ جاں، وہ آقا، وہ دلبر وہ دلدار

نعتیہ قصیدہ

سمِ دوراں کا مہلک سلسلہ ہے
مسلسل مارا ماری کی ہوا ہے

وہ روئے عصر کہ گھائل ہوا ہے
سوادِ دل کہ آگے سے سوا ہے

کسی کو مکر ہی سے واسطہ ہے
کوئی کرم حسد سے کھوکھلا ہے

رواں ہے سلسلہ رسمِ ہوس کا
ہوس کی ڈھول سے ہر دل اَٹا ہے

کسی کو لُوٹ کر مسرور کوئی
کوئی لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے

ادھر کوئی ہے محوِ سود کاری
اُدھر اکراہ آدم کی صدا ہے

مئے مُسکر کسی کو راس آئی
کوئی احساس سے عاری ہوا ہے

عمل ہے مارا ماری کا مکمل
وہ ڈالی دے اسامی لے اُڑا ہے

حرامی مال سے عمرے کا سودا
گماں کا دودھ ہے، سرکہ ملا ہے

درِ داور سے مسلم دُور ٹھہرا
درِ دارا کا ہر کوئی گدا ہے

عدم کو لد گئے عالی ہمم ، سو
کم اصلوں کی وہی مادی ادا ہے

گریز

مداوا عمر کے گھاٹے کا کوئی
کہاں آسودگی کا سلسلہ ہے؟

دلاسے کا امر گر ہے ، کہاں ہے؟
کہاں دارو مرے دُکھ کا دھرا ہے

اسی لمحے صدا گردوں سے آئی
دوائے ہر الم مہرِ حرا ہے

وہی اک آس ہے عاصی کے دل کی
اسی کا اُسوہ ہر دکھ کی دوا ہے

مٹا ڈالی اساسِ وہم دل سے
وہی دارو دلوں کے روگ کا ہے

مطلع

محمد اسم ، حمد اس کی ادا ہے
ملک ہر کہہ رہا صلی علیٰ ہے

مرا ممدوح ، ممدوحِ الٰہی
کہ داور اس کا دل دادہ ہوا ہے

حمود و حامد و محمود ہے وہ
وہی اکرم ، مکرم اور ہادی ہے

وہی طاہر ، وہی عالم ، وہ حاکم
وہی مدعو ہے ، داعی سدا ہے

وہی ہے مطلعِ ادراکِ اسریٰ
اُسی سے آگہی کا در کھلا ہے

وہی صدرِ رسل ، اصلِ عوالم
اُسی کے واسطے ہی دوسرا ہے

وہ طٰہٰ ہے مددگارِ مسلم
کرم سے اس کے ہر کوئی لدا ہے

وہ اُمّی عالمِ کُل کا معلم
حصولِ علم سے اس کو ولا ہے

وہی ہے ہادیِ دوراں سراسر
وہی اک محورِ دادِ ہدا ہے

صراطِ واصلِ داور وہی ہے
وہی اک مصدرِ رحم و عطا ہے

وہی آگاہِ اسرارِ الٰہی
لوائے حمد اُس کو ہی روا ہے

وہی ہے کامل و اکمل مکمل
کلام اللہ سے آئی صدا ہے

اُسی سے ولولہ سرمدی ہے
اُسی کے دم سے رومی کی ادا ہے

وہی ہے دہر میں اولیٰ و اعلیٰ
اُسی کی مدح میں مطلع ہوا ہے

ہے مطلع وہ کہ دل عالم کا ٹھارے
کہ کلکِ روح سے مطلع لکھا ہے

مطلع

وہاں ہر اک گدا کا دل ہرا ہے
وہاں سائل مسائل سے رہا ہے

وہی اصلاح کارِ روحِ عالم
اُسی سے رُوئے عہدِ سم ڈھلا ہے

وہی مکروہ رسموں کا ہے ماحی
کہ ہر حوا کے وہ سر کی ردا ہے

کٹی اوہام کی ہے لو مکمل
وہ روحِ اصل کی اصلی صدا ہے

رواداری کا وہ حامل ہے اول
دوم دھوکا دہی سے ماورا ہے

اسے ہر آدمی دل سے مکرم
وہی اک عدل کا حامی سدا ہے

عدوئے سرد مہری مہر اُس کی
عدوئے بے کسی اُس کی ولا ہے

حدود اللہ سے اس کو لگاؤ
لگاؤ اور ہر اک سے سوا ہے

وہی اک دُور کوسوں کھوٹ سے ہے
اُسی کا امر اصلی ہے، کھرا ہے

رہائی آدمی کو دی ہے دکھ سے
وہی روح و رواں سکھ کا سدا ہے

وہی دکھ درد کے ماروں کا ماوا
وہی دارالاماں ہے، آسرا ہے

حسنِ طلب

کسے دعویٰ محامد اس کے لکھے
محامد کوئی اس کے لکھ سکا ہے؟

ہوا کس سے مکارم کا احاطہ
کمال اُس کا کہاں سارا کھلا ہے

دعا کا ہے سے عاجز دعا کر
ملا مداح کو عمدہ صلہ ہے

حسود اسلام کے سارے مٹا دے
مرے داور! مرے دل کی صدا ہے

مٹا دے گردِ محرومی کی دل سے
امامِ مرسلاں کا واسطہ ہے

مری اولاد، ہمدم، والد و ماں
ہر اک آسودہ ہو دل سے دعا ہے

لحد آرام کا اک گھر اگر ہو
کہوں طالع مری، طالع رسا ہے

مرادِ دل ملے اے محرمِ دل!
رسائی در کی دل کا مدعا ہے

ملے آسودگی راہ عدم کی
دلِ محروم کی اک ہی دعا ہے

نوید عاجز

سلام

نشاط نشہ صبر و رضا میں رہتا ہے
مرا یہ قلب حزیں کربلا میں رہتا ہے

کسی مقام پہ یہ مضمحل نہیں ہوتا
حسینؑ! آپ کی جو اقتدا میں رہتا ہے

سرور و کیف سے دل اس کا مشکبار ہوا
جو منہمک غم آل عبا میں رہتا ہے

خدا، رسول، فرشتے، بشر اسی کے ہیں
جو سر کٹا کے بھی اس کی رضا میں رہتا ہے

شہادتوں نے عبادت کو رونقیں بخشیں
کہ ان کا ذکر جلی ہر دعا میں رہتا ہے

نثار اس کے ثبات قدم پہ قلب و نظر
جو خون دے کے بھی دین ہدیٰ میں رہتا ہے

مقام سید عالی مقام! تجھ پہ سلام
کہ تو نگاہ شہ انبیا میں رہتا ہے

یہ ان کی چشم تلطف کا فیض ہے کہ یہ دل
حریم خلد کی آب و ہوا میں رہتا ہے

وہ دشت کرب و بلا، سجدہ گاہ اہل جنوں
ریاض کعبہ جاں اس فضا میں رہتا ہے

سید ریاض حسین زیدی

سلام

لہو رُلاتی ہے جب مجھ کو یادِ شامِ حسینؓ
توشب گزرتی ہے آنکھوں میں سب بنامِ حسینؓ

مرا پتہ ہے وہی یعنی کربلائے عظیم
جو پوچھتے ہو مرا نام تو : غلامِ حسینؓ

کبھی نہ رکھتے یہ جبر و ستم روا ہم پر
جو تم نے سُن لیا ہوتا کبھی کلامِ حسینؓ

نبیؐ کا شانۂ اقدس اُنھیںؓ میسر تھا
سو اِس سے ہوتا ہے اندازۂ مقامِ حسینؓ

زمانے بھر میں ہُوئے محترم ہم اُنؓ کے طفیل
سو کم ہے کیجیے جتنا بھی احترامِ حسینؓ

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آپؐ کے ساتھیؓ جھلمل جھلمل راہ نما تارے
آپؐ کا گھرؓ ہے دین کی کشتی، گھر والے پتوار

سلام

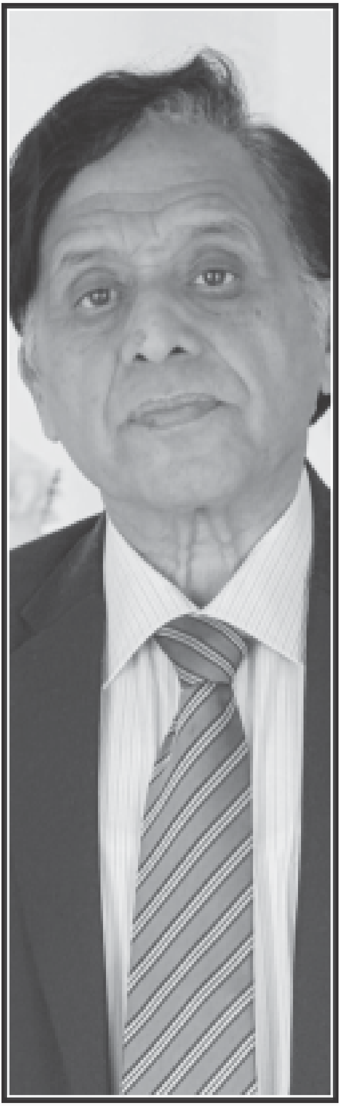

فراتِ درد سے لبریز اپنا سینہ ہے
غمِ حسینؑ کی سرشاریوں میں جینا ہے

یہ غم وہ غم ہے جو آنکھوں کے واسطے ہے شفا
یہ سیلِ نور ہے بخشش کا اِک خزینہ ہے

غمِ حسینؑ وظیفہ ہے میری ہستی کا
سو میری زیست میں شامل یہی قرینہ ہے

مَیں اس کے فیض سے پاتا ہوں منزلوں کا نشاں
کہ ذکرِ آلِ نبیؐ ہی مرا سفینہ ہے

وفا کے باب میں ایسی کوئی مثال نہیں
وفا انگوٹھی کا عباسؑ ہی نگینہ ہے

وہ جس نے عظمتِ دیں کو حیاتِ نو بخشی
ہر اک مہینہ اُسی شاہ کا مہینہ ہے

نبیؐ کے خون سے پائی ہے زندگی اُس نے
جہانِ عشق میں روشن جو آبگینہ ہے

نثار ترابی

مولا حسینؑ کی نذر

میرے سردار ترا سوگ مناتے جاتے
ہنسنے والے بھی تجھے روتے رلاتے جاتے

میں انھیں شاہ کی روداد سناتا جاتا
لوگ لفظوں سے تصاویر بناتے جاتے

جانے شبیر کو احباب نے کیوں چھوڑ دیا
کیا بگڑتا تھا اگر ساتھ نبھاتے جاتے

قبر میں پاس مرے مولا علی آئیں گے
میں ہوں سرشار بہت قبر میں جاتے جاتے

دشت میں گھیر کے تم لوگ جسے لائے ہو
کاش تم لوگ اُسے سر پہ بٹھاتے جاتے

یہ ہی قرآن کے والی ہیں یہی وارث ہیں
یہ جو مقتول ہیں قرآن سناتے جاتے

ہائے رے، شہ نے کئی بار پلٹ کر دیکھا
سرورِ دیں! ترے شہر سے جاتے جاتے

کیوں نہ شبیر کی ماں تم کو دعائیں دیتی
تم اگر مجلسِ شبیر میں آتے جاتے

سب کو حالات سے آگاہ کیا تھا انصر
شہرِ سرور سے مرے شاہ نے جاتے جاتے

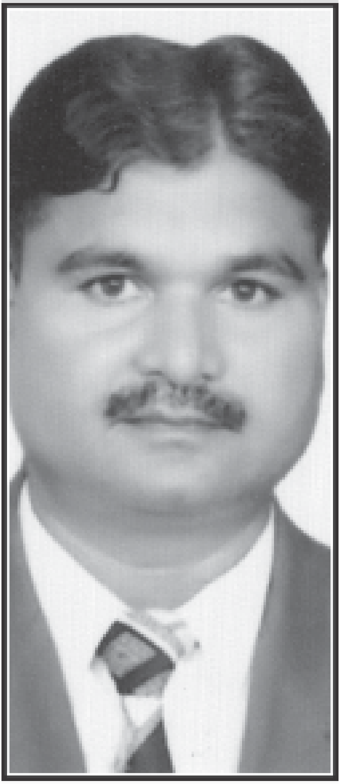

انصر حسن

سلام

صبر کی ہیں تصویر حسینؓ
سچ کی ہیں تفسیر حسینؓ

حق و باطل کے مابین
کھینچی ایک لکیر حسینؓ

نانا دیں کے ہیں سردار
نانا کی جاگیر حسینؓ

خون سے اپنے کربل میں
لکھی کیا تحریر حسینؓ !

رحمیوں کی اک پل میں
بدل ڈالی تقدیر حسینؓ

سجدہ کرکے جاں دینا
دی ہے فقط نظیر، حسینؓ

تھے صحرا میں پیاسے
جنت کے وہ امیر، حسینؓ

جرات و عظمت کا مینار
تیری وہ شمشیر، حسینؓ !

ظلمت کے اس دور میں اب
امید کی ہیں تنویر، حسینؓ

صدیوں سے لاریب شفیق
ہم تیرے دلگیر، حسینؓ !

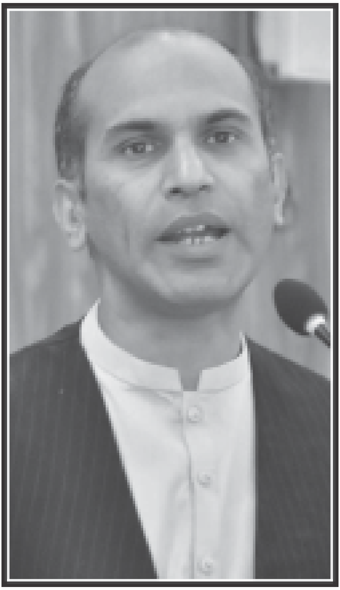

محمد شفیق انصاری

سلام

سرور حسین نقشبندی

یہ ظلمتوں کا چاک ہے یہ کربلا کی خاک ہے
فلک پہ اس کی دھاک ہے یہ کربلا کی خاک ہے

لبِ مہ و نجوم پر ہیں اب بھی اس کے تذکرے
شفق سی تابناک ہے یہ کربلا کی خاک ہے

یہ کیا کیا حسین نے کہ اب بھی اس زمین پر
ستم گروں کی ناک ہے یہ کربلا کی خاک ہے

ملی ہوئیں محبتوں کی سرحدیں ہوں جس طرح
عجب یہاں تپاک ہے یہ کربلا کی خاک ہے

اذیتوں کے قہر کا اور انتہائے صبر کا
یہاں پہ اشتراک ہے یہ کربلا کی خاک ہے

صداقتوں کی اس جگہ رقم ہوئی ہے داستاں
یہ مصلحت سے پاک ہے یہ کربلا کی خاک ہے

شکست و فتح کے یہاں اصول ہی بدل گئے
یہ کربلا کی خاک ہے یہ کربلا کی خاک ہے

زمانے بھر کی حیرتوں کا سرور اس زمیں پر
طویل انہماک ہے یہ کربلا کی خاک ہے

سلام

فکر، صبر و رضا، حسین کا غم
سب غموں سے جدا حسین کا غم

جب شہیدوں کے درد کا سوچا
مجھ پہ نازل ہوا، حسین کا غم

ضبط ٹوٹا تو اشک بار ہوئے
منکشف ہو گیا، حسین کا غم

آنسوؤں سے وجود بھرنے لگا
ہو رہا تھا عطا، حسین کا غم

یاد آتے ہی آنکھ بھر آئی
روح تک گھل گیا، حسین کا غم

بوجھ دل کا اتار دیتا ہے
آنسوؤں نے کہا، حسین کا غم

وہ کبھی بے سکوں نہیں ہوگا
جس کے دل میں رہا، حسین کا غم

عصر کا وقت پیاس اور خیمے
کربلا کربلا، حسین کا غم

یہ رہائی ہے نار دوزخ سے
خلد کا راستہ حسین کا غم

محمد نوید مرزا

دوہے

باسی روٹی رات کی ، مل جائے گر یار
پانی پی کے جھیل کا ، جا اتریں گے پار

مسجد، مندر، دیر میں ، مجھ سے کس کو بیر
کاسہ چھوٹا ہاتھ سے ، مٹی ہو گئی خیر

چھلنی بھر بھر ریت سے، وقت گزاروں آج
مرشد میرے نام کی ، تُو ہی رکھنا لاج

تیرے درشن واسطے ، دنیا دیکھے خواب
میں رستے کی دھوپ ہوں ، بنتا تھا کمخواب

مچھلی تڑپے جھیل میں ، پنچھی اوپر پیڑ
عشق الاؤ تیز ہے ، کوئی حصہ چھیڑ

کچی مٹی راستہ ، پانی کی بوچھاڑ
کِھل کِھل مجھ کو دیکھنا ، بدلی کر کے آڑ

کوشش کر کے دیکھ لی ، کوشش بھی سر توڑ
جوڑ ملایا توڑ سے ، ہویا سب بے جوڑ

میٹھی میٹھی نیند سے ، خود کو اب جھنجھوڑ
سورج سر پہ آ گیا ، خواب کی وادی چھوڑ

رات گزاری جاگ کے کر کے باتیں لاکھ
لو لو کوئلہ ، اندر باہر راکھ

تُو ہی مجھ کو عام ہے ، تُو ہی مجھ کو خاص
ہر جانب ہے تُو ہی تُو ، شہر ہو یا بن باس

دھوپ کا نکلا راستہ ، بدلی بدلی پیاس
تیری چھایا چاہیے ، لے لے میرا ماس

سعید اشعر

گیت

سلیم فگار

پھروں من میں ایسی تڑپ ہے

جلتا ہے یہ دل جس اگنی
تم نے بات نہیں وہ سمجھنی
تم میں کبھی وہ کسک نہیں جگنی

میں دل کی کیا بات کروں اب

آنکھوں میں جو ایک لپک ہے
صدیوں سے بھی گہری کسک ہے
جی کو جانے کیسا قلق ہے

کچھ پل بھی آرام نہیں ہے

کب آنکھوں کی پیاس بجھے گی
کب یہ وصل کی آس بجھے گی
آنے سے کب پاس بجھے گی

روح میں جو یہ آگ لگی ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ لوگ تو آنسو بھی بہانے نہیں دیتے
نیکی کو بھی دریاؤں تک آنے نہیں دیتے

ہائیکو

فرخندہ شمیم

کربلا کے سینے پر
یہ جو آن اترے ہیں
وقت کے سکندر ہیں

....

گیارھویں محرم کو
کربلا کے خیموں سے
ماہتاب شرمندہ

....

کبر کے میناروں پر
دھول پڑتی دیکھی ہے
تھا بیان زینب کا

....

اصغر نے تشنگی اپنی
رب کی رضا پہ وار دی
دریا ہی پیاسا رہ گیا

....

اوڑھنی فقط آنچل
چادروں میں چادر تو
بس ردائے زینب ہے

رباعیات

اک سلسلہ جاری ہو طلب شعر کی تھی
افسوں کوئی جاری ہو طلب شعر کی تھی
ہم کون تھے اس راہ پہ آنے والے
پہچان ہماری ہو طلب شعر کی تھی

....

کردار کی خاطر ہے کہانی لازم
رفتار کی خاطر ہے روانی لازم
چرچا کسی بندے کا بلاوجہ نہیں
ہے اس کے لیے فیض رسانی لازم

....

لائے ہمیں کیوں گردشِ افلاک اوپر
ہم خاک نشیں آئیں گے کیا خاک اوپر
دنیا کے سمندر میں یہی دیکھا ہے
نیچے نور و گوہر خس و خاشاک اوپر

....

غافل سفرِ عمر سے ہونا میرا
ہے گنجِ زیاں وقت کا کھونا میرا
ہے اُس کی نظر دولتِ بیداری پر
صراف کو بھاتا نہیں سونا میرا

....

ظلمت کی تگ و تاز سمٹ جاتی ہے
ماحول میں درخشندگی بڑھ جاتی ہے
اک شمع کی لو کم سہی لیکن اُس سے
کیا روشنی بڑھتی ہے کہ گھٹ جاتی ہے

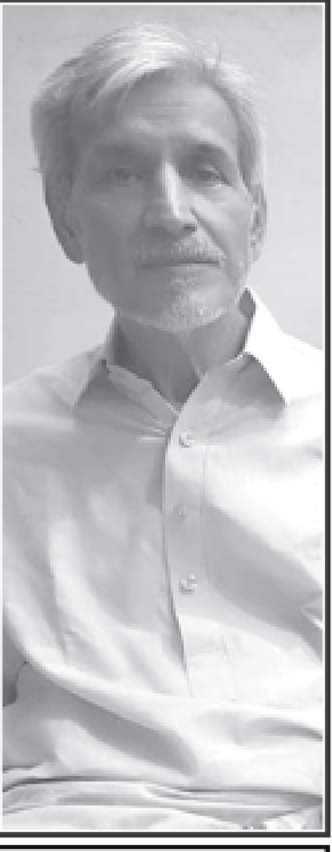

گلزار بخاری

رباعیات

شہ رستے گریز پا ہوئے کعبے کے
شاہی غم رو نما ہوئے کعبے کے
آج ابراہیم کی صدا آ رہی ہے
بت اعزازی خدا ہوئے کعبے کے

جینا بھی تو مرنے کا تقاضا ہے یہاں
ایسا دریا ہے دل کہ پیاسا ہے یہاں
روتی خوشیوں کے غم سے ڈرتا کیوں ہے
اٹھ ناچ کہ آدمی تماشا ہے یہاں

تصویر ہے شیشہ مری حیرانی کی
میں چیخ ہوں تہذیبِ انسانی کی
کوئی در آئے شہر کے جنگل میں
تعمیر کرے کعبہٗ ایمانی کی

آئینہ دیکھ کر یقیں ہوتا ہے
اپنے سے سوا کون حسیں ہوتا ہے
آئینے خواب دیکھتے رہتے ہیں
پانی میں کوئی چاند نہیں ہوتا ہے

اے حسن تری کلائی کا زور ہوں میں
خاموش تری نگاہ کا شور ہوں میں
میں مر گئی خود سے لڑ گئی آنکھ مری
اے عشق مدد کہ زندہ در گور ہوں میں

آئینہ طاؤس قبا دیکھتے ہیں
ہر رنگ ترا رنگ نما دیکھتے ہیں
مغرور حسینہٴ غزل پردہ اٹھا
پردے میں ترے پردہ کشا دیکھتے ہیں

آئینے لباسِ اسم میں ڈوب گئے
منظر سارے طلسم میں ڈوب گئے
معلوم نشاطِ لذتِ وصل کہاں
ہم ہجر نصیب جسم میں ڈوب گئے

پیدا نہ ہوا دام کشادہ نہ ملا
عریانی سے کم کوئی لبادہ نہ ملا
ساقی کی آنکھ سے چھلک جاتا میں
بادہ مجھے ظرف سے زیادہ نہ ملا

محمد نصیر زندہ

رباعیات

اس دل کا سکوں میرے مقدر میں نہیں
وصلت کا فسوں میرے مقدر میں نہیں
مصروف ہوں دن رات کئی کاموں میں
صحرا کا جنوں میرے مقدر میں نہیں

....

جیون کی کھلی کتاب ہم پڑھتے ہیں
تالاب میں آفتاب ہم پڑھتے ہیں
لفظوں کی کوئی قید نہیں ہے واجب
تعبیر سے ہٹ کے خواب ہم پڑھتے ہیں

....

یہ دل ذرا آباد ہے بالکل بھی نہیں
برباد سا برباد ہے بالکل بھی نہیں
اب تک کوئی زندہ ہے جو میرے اندر
شاید مرا ہمزاد ہے بالکل بھی نہیں

....

چندا ہے ابھی جھیل میں ایسا بھی نہیں
کچھ وقت ہے زنبیل میں ایسا بھی نہیں
پانی میں بلاتا ہے ترا عکس مجھے
تاخیر ہے تعمیل میں ایسا بھی نہیں

....

اس طور بھی حالات بدل جاتے ہیں
دن رات مقامات بدل جاتے ہیں
نقشہ وہی رہتا ہے زمیں پر لیکن
شہروں کے مضافات بدل جاتے ہیں

....

الفاظ میں روشنی سلامت نہ رہی
کردار کی چاشنی سلامت نہ رہی
ہر شخص کو الہام یہاں ہوتا ہے
اشعار میں شاعری سلامت نہ رہی

....

ہر چیز سے ہر بات سے ڈر لگتا ہے
دن رات کے حالات سے ڈر لگتا ہے
ہر شخص پریشان ہے جیسے اب تو
انسان کی اوقات سے ڈر لگتا ہے

....

ساون کی گھٹاؤں کو کبھی دیکھا تھا
بے صبر ہواؤں کو کبھی دیکھا تھا
معصوم سے اک پیکرِ نوری کے طفیل
بے رحم اداؤں کو کبھی دیکھا تھا

سعید اشعر

رخشندہ نوید کی نظم ''خوشبو کا کھیل'' کا ایک تجزیاتی مطالعہ

میرے لیے ایک خوشگوار حیرت کا مقام تھا جب محترمہ رخشندہ نوید نے اپنا تازہ شعری مجموعہ ''نیناں اُتریں پار'' عنایت کرتے ہوئے بڑی رسان سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب اس پر کچھ لکھیں۔ میں نے کچھ تامل کیا کہ مجھ ایسا ادب کا معمولی طالب علم اُس شاعرہ کے بارے میں کیا لکھے گا کہ جس کے روشن مستقبل کی بشارت، احمد ندیم قاسمی اور منیر نیازی جیسے مشاہیر ادب دے چکے ہوں، ڈاکٹر خورشید رضوی جیسے جید اُستاد نے جسے سندِ فضیلت عطا کی اور جس کے بارے میں بانو قدسیہ برملا کہتی ہوں کہ ''جینے اور لکھنے کا یہ سلیقہ کچھ اتنا عام نہیں''۔ بہرحال تینوں مجموعہ ہائے کلام، ''پھر وصال کیسے ہو''، ''کسی اور سے محبت'' اور ''نیناں اُترے پار'' کے مجموعہ مطالعے سے جہاں کچھ عمومی تاثرات مصرع مصرع ٹھہرے ہوتے گئے وہیں کچھ رنگ تتلی کی طرح کھلتے گئے اور ایک سرشاری مشامِ جاں میں خوشبو کی طرح پھیلتی گئی اور پُرکشش آنکھوں والی عام سی اک شاعرہ'' بڑے وقار اور تمکنت کے ساتھ شہرِ سخن میں رنگ اور خوشبو بکھیرتی نظر آئی۔

رخشندہ نوید کے شعری سفر کا آغاز تو شوخ رنگوں کی بہار سے ہوتا ہے لیکن اب اُس کی ترجیح میں رنگ پسِ منظر میں چلے جاتے ہیں اور خوشبو اُس کی خصوصیت اور خاصیت بنتی نظر آتی ہے، جس کا واضح اظہار رخشندہ کی نظم ''خوشبو کا کھیل'' میں ملتا ہے۔ اس نظم پر تفصیلی بات کرنے سے پہلے رخشندہ کی اپنی شاعری سے کچھ داخلی شہادتیں تلاش کی جائیں کہ خوشبو اُس کا مسئلہ کیونکر ہے؟

کھڑی ہوں میں روشنے کی جالی سے لگ کر
میں خوشبو ہی خوشبو، سمیٹے ہوئے ہوں

اُس ایک شخص کی خوشبو میں باغ باغ رہی
جو پھول بن کے مری زلف میں کھلا ہی نہیں

وہ اک خوشبو سا لمحہ جس کو عہدِ زرد نے چھینا
درختوں سے گھرے جنگل میں اُس کی جان جاں ڈھونڈیں

....

آیئے ملتے ہیں رخشندہ نوید سے کہ ''جس کی شاخِ تن پر لباس کی شوخی بھی گلاب کی صورت کھلتی ہے''...... وہ رخشندہ کہ جس کی روح گلابوں کی مہک سے سرشار ہے لیکن کانٹوں میں تنہا کھڑی''۔ ''سرخ گلابوں کی خوشبو کو زیبِ تن کرتی اور موتیے کی کلیوں کو اپنے سر پہ وارتی ہوئی رخشندہ''...... ''وہ رخشندہ کہ، جب وہ سنتی ہے کہ اُس کے محبوب کے شہر میں برف پڑ رہی ہے تو وہ بھی

کوثر محمود

کیری کی خوشبو سے ملتا جلتا سبزہ مائل رنگت کا دوشالہ ڈھونڈنے نکل پڑتی ہے کیونکہ یہ رنگ اُسے کسی کی آنکھوں کی یاد دلاتا ہے۔''

آمدم برسرِ مطلب......

اگرچہ خوشبوؤں کے جہانِ اسرار کے بارے میں مکمل آگاہی محالات میں سے ہے لیکن اوراقِ سابق میں پیش کردہ معروضات سے اس نظامِ زندگی میں خوشبوؤں کے ایک منفرد کردار کا ایک مبہم سا خاکہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس عالم اسرار کو بیان کرنے کے لیے رخشندہ نوید نے ایک جامع عنوان کا انتخاب کیا ہے جس میں اسرار تحیر، وسعت کے ساتھ ایک انتہائی پیچیدہ صناعی ایک لازمی جبری نظام کے تحت ٹھیک ٹھیک کام کر رہی ہے۔ ذرا پہلا مصرع تو دیکھیے:

خیالوں کی دنیا کے بے خواب رستے

آپ نے چاہے جتنا خوبصورت خواب دیکھا ہو، طویل ہو یا مختصر، جب اُسے بیان کرنے لگیں تو پتہ چلے گا کہ اُسے ایک فیصد بھی بیان نہیں کر پائے بالکل اُسی طرح کہ کسی خوشبو کو کتنا ہی شرح وبسط کے ساتھ بیان کرتے جاؤ تو عجزِ کلام حرف حرف جھلکنے لگتا ہے اور انسان یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ (اپنے مدرکات کی تحدیدات کے ساتھ) خوشبو کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اور اس کا بیان ناممکن ہے۔ خوشبو اور خواب میں بھی یہی مماثلت ہے کہ کوئی ان کو روم روم سے محسوس کرے تو کرے لیکن جب ان کو لفظوں کا جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے تو یہ کسی اور ہی پیکر میں ڈھل جاتے ہیں، اچھے اچھے خواب دیکھنے کے لیے پُرسکون نیند شرطِ اوّل ہے اور من چاہی خوشبو، اور کسی من بھاونے کی مہک بھی میسر ہو تو اور کیا چاہیے! لیکن خوشبو سے خالی، بے خواب راتیں شاید ادیبوں شاعروں کا مقدر ہیں۔

کسی شے کو سلیقے سے بیان کرنے کے لیے مناسب الفاظ کا چناؤ اور ان الفاظ کو مہارت سے برتنا ہی شعری دستگاہ کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ رخشندہ نے پہلے مصرعے، ''خیالوں کی دنیا کے بے خواب رستے'' میں لفظ خیال کو باندھ کر عنوان کو حتی الامکان گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ لفظ خیال ''خیل'' سے نکلا ہے جس کے ایک معنی بادل کے بھی ہیں اور جس طرح بادل ہر گھڑی اپنی شکلیں بدلتے رہتے ہیں اسی طرح خواب وخیال اور خوشبو بھی کبھی کسی یکساں حالت پر نہیں رہتے سو رخشندہ کا ہر لحہ بدلتی ہوئی زندگی کا ہمہ جہتی سے تطابق (Synchronizaiton) پیدا کرنے کے لیے خوشبو کو خیال اور خواب سے تعبیر کرنا سادگی و پرکاری کی عمدہ مثال ہے۔ دوسرا مصرع دیکھیے:

کوئی آواز چاہے کیسی ہی بے معنی کیوں نہ ہو، ہماری توجہ کو فوراً اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور ہم صرف اسی کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں بھلے وہ کتنی ہی غیر اہم کیوں نہ ہو لیکن وہ ہمارے گیان دھیان اور استغراق میں خلل ڈال دیتی ہے اور جب مکمل خموشی ہو تو پھر معاملات کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ جب ہم بالکل خاموش ہو کر کسی طرف دھیان لگاتے ہیں تو غیر محسوس

طریقے سے ایک وسعت اور کشاد ہمارے سینے میں بھرتی چلی جاتی ہے اور یہی رائے صائب ہے کہ خوش رہ کر ہی انسان کو اپنی ذات کا عرفان حاصل ہو سکتا ہے اور خواب، شاعری اور روحی وغیرہ اسی بالائے حسیات مشاہدے (Extra Sensory perception) کی ذیل میں آتے ہیں:

میں چلتی رہی ہوں ہوا کی طرح
مست قدموں کی جھنکار کی آرزو میں

....

زندگی کے بہاؤ کو ہوا کے جھونکے سے تعبیر کرنا کیا ہی اچھی کاوش ہے، لیکن دوسرا مصرع، "مست قدموں کی جھنکار کی آرزو" بظاہر اُکھڑا ہوا نظر آتا ہے، اس مصرعے کو خوشبو سے کیسے Corelate کیا جائے؟ ایک توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ پاؤں میں مہندی لگی ہوئی ہو اور مہندی کی ہلکی خوشبو سے مرد اور عورت کے درمیان مستقل سماجی گرہستی کے بندھن کی طرف اشارہ ملتا ہے:

یہ بے نام خوشبو، یہ گھنٹی مرے دل میں بجتی رہی ہے
یہ دھڑکن مرے لب پہ سجتی رہی ہے
یہ بے نام خوشبو وہ جھونکا نہیں ہے
یہ بے نام خوشبو وہ جھونکا نہیں ہے
نہ میرے مسیحا کی آواز پا ہے

....

بے نام خوشبو کو فیرومون کے تناظر میں دیکھیں تو ایک شدید قسم کی Discontentment بے اطمینانی اور اضطراب کا عکس جھلکتا ہے اور شاعرہ کسی مسیحا کی آواز پا کو ترس رہی ہے۔ لفظ مسیحا (بمعنی مسح کیا گیا) اپنے اندر ایک جہان معنی رکھتا ہے۔ یہودیوں میں رواج تھا کہ بادشاہ کی تاج پوشی کے وقت اُس کے سر پر مقدس تیل کا مسح کیا جاتا تھا (یعنی اُس کے سر پر مقدس تیل ملا جاتا تھا) اور چونکہ یہودی اپنے کسی موعود بادشاہ کے منتظر تھے لہٰذا حسبِ دستور حضرت عیسیٰؑ کے لیے مسیحا کا لقب اختیار کیا گیا (یعنی مسیحا "مسح کیا گیا" یا اصطلاحاً "جسے خدا کی طرف سے بادشاہی دی گئی" اور حضرت عیسیٰؑ کے معجزات میں بیماروں کو شفا دینا، کوڑھیوں کو بھلا چنگا کر دینا شامل تھا لہٰذا یہ لفظ اپنے بھرپور تلازمے کے ساتھ یہاں برتا گیا ہے۔

رخشندہ اپنے باطنی کرب، ظاہرہ دکھوں اور تمام Aliments سے نجات کے لیے کسی مسیحا کے "لمسِ معجزنما" کی منتظر ہے یہ لمس کسی انسان کی شکل میں بھی ممکن ہو سکتا ہے اور شاعری کی تجسیم کی صورت میں بھی ممکن ہے۔ دکھ، تنہائی، کرب، اضطراب تخلیق کے لیے مہمیز کا کام کرتے ہیں بقول شعیب بن عزیز:

تنہائی کے دوزخ سے بھی گزرا ہوں میں لیکن
بے لطف رفاقت کا عذاب اور ہی کچھ ہے

....

لیکن منیر نیازی نے کیا پتے کی بات کہی کہ شاعر ایک زندگی پر قناعت نہیں کر سکتا، نئے نئے امکانات کی خواہش، طلب اُسے بے چین رکھتی ہے۔

میں خوشبو کے ہاتھوں میں کھیلی بہت ہوں
میں اب بھی اکیلی اکیلی بہت ہوں

☆☆☆☆☆

واللہ اعلم ___ درخشندہ شاعری

یہ گاؤں بھی عجیب ہوتے ہیں، بندے کے اندر سے نکلتے ہی نہیں۔ میرے اندر میرا گاؤں سانس لیتا ہے۔ آج رخشندہ نوید کا مجموعہ کھولا تو ہر صفحے پر ایک دیا سا ٹمٹماتا نظر آیا، جس کی لو میں گاؤں کے مناظر نظر آنے لگے۔ یہ شاعری بھی بھید بھری باتوں سے بھری ہوتی ہے، جیسے شہد مٹھاس سے بھرا ہوتا ہے، جیسے تل میں تیل نظر نہیں آتا، اسی طرح چاندنی کی ٹھنڈک بھی دلوں کو مسحور کرتی ہے، دکھائی نہیں دیتی۔

'خالی آٹا دسمیا ناہیں' پڑھتے ہوئے بھی قاری گاؤں کے کھلے آسمان کی چاندنی میں بھیگ جاتا ہے۔ شاعرہ نے اپنی ماں بولی میں شعر کہہ کر اپنی لاج رکھ لی ہے۔ ایسے لگتا ہے اکیسویں صدی کی تیز رفتار زندگی میں ہانپتی کانپتی یہ شاعرہ ایک روز سب کچھ تیاگ کر چپ کے حجرے میں بیٹھ جائے گی کیونکہ جو نوازے جاتے ہیں ان پر اکلاپا مسلط کر دیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

ابھی یہیں تک لکھ پایا تھا کہ ایک استاد نما شاعر کا فون آ گیا۔ کیا ہو رہا ہے جناب؟

'ایک شاعرہ کی شاعری میں کھویا ہوا ہوں۔' میں نے جواب دیا۔

دوسری طرف سے آواز آئی: 'یہاں عورتوں میں کوئی دو چار ہی شاعرات ہیں باقی تو سبھی سفید کاغذ پر اصلاح لینے والی ہیں اور ویسے بھی عورت تو خود شاعری ہے، وہ شعر کہنے کے کرب ناک عمل سے کیسے گزر سکتی ہے؟

میں نے کہا: 'عورت سے بڑا تخلیق کار کون ہو سکتا ہے؟ جو شاعر، سیاستدان، سائنسدان پیدا کرتی ہے۔'

ادھر کچھ دیر خاموشی چھائی رہی، پھر آواز آئی: 'نہیں یار یہ جو ہمارے ہاں شاعرات ہوتی ہیں ناں میں انھیں آدھا مرد ہی تسلیم کرتا ہوں، ہاں اس حد تک تخلیق کار ضرور مانتا ہوں کہ یہ گھر گرہستی سے زیادہ حرف وصوت سے جڑی رہتی ہیں۔ اچھا چھوڑو یار مریم نواز اور میاں نواز شریف جمعہ کو واپس آ رہے ہیں..... تو؟'

میرے اس تو پر وہ بولا: 'یار مریم نواز کو کیا آٹا گوندھنا آتا ہوگا؟'

میں اس بے موقع اور کسی حد تک بے تکے سوال پر ٹپٹا کر رہ گیا۔

میں نے صرف اتنا کہا: 'یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ مریم نواز آٹا گوندھ لیتی ہے یا پیڑے بنا کر روٹیاں پکا لیتی ہے مگر میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ ایلیٹ کلاس گھرانوں میں یہ سارے کام خانسامے اور ملازمین خواتین کے ذمے ہوتے ہیں۔' لمحہ بھر توقف کے بعد وہ بولا: 'جس طرح ممی ڈیڈی گھرانوں کی بچیاں

اختر شمار

بمشکل انڈہ ابالنے، یا چائے بنانے کے سوا کچن کے کام کاج میں مہارت نہیں رکھتیں۔ اسی طرح وہ شاعرات جو واقعتاً خود شعر کہہ رہی ہیں، گھر خواتین میں شمار نہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ یا تو عورت 'چولہا چوکی' بہترین کرسکتی ہے یا پھر کوئی اور کام، سو شعر کہنے والی خواتین کو بھی بس مرد ہی سمجھو۔'

میں نے بات کاٹ کر کہا: 'بالکل اسی طرح جیسے بعض مرد شاعر حضرات میں زنانہ خواص بھی ہوتے ہیں۔'

دوسری طرف قہقہہ بلند ہوا۔ یار تمھاری بھابی آ گئی ہے، فون بند کرتا ہوں، اس نے آج مجھے آلو چھیلنے کا کام سونپ رکھا تھا اور میں نے ابھی آلو دھوئے بھی نہیں، رب راکھا۔'

میں دیر تلک سر پکڑے بیٹھا رہا۔ بمشکل در کتاب دوبارہ کھلا اور میں 'حالی آنا دسیا نا ہیں' کے نگار خانے میں اتر گیا۔ جس میں شاعرہ اس دوشیزہ کی طرح لگتی ہے جسے ماں کی نصیحت اب تک نہیں بھولی۔

ون ڈوبن توں پہلا پڑھ لیں روز سپارہ کڑیے

اس شعری مجموعے کو پڑھتے ہوئے کئی ایسے الفاظ بھی سامنے آئے ہیں کہ پنجاب کی رہتل آنکھوں میں رقص کرنے لگتی ہے۔ شعرا کو مرتے ہوئے لفظوں کو زندگی عطا کرتے رہنا چاہیے اپنی رخشندہ کی طرح ۔۔۔ مثلاً

گاچی تو دیہات میں بھی گواچ گئی ہے۔ کسی بھی طالب علم کو اب گاچی سے واسطہ نہیں پڑتا۔ نہ تختی نہ سلیٹ، نہ قلم دوات، اب ان کی جگہ کاپیوں اور پوائنٹر پنسلوں نے لے لی ہے۔ کپڑے دھوتے وقت اب تو گاؤں میں بھی واشنگ مشین کام آتی ہے، تھاپی کا استعمال کم ہی ہوتا ہے۔ گاؤں کی کئی چیزیں، پنجابی شاعری میں سے جھانکتی مجھے اچھی لگتی ہیں۔ بعض اشعار بالکل نویکلے ہیں:

کوڑی گری تا لو نل لگ کے جا بیٹھی
میں چلغوزے چھل چھل نونہہ تڑوا بیٹھی

چنگے چنگے کپڑے جتیاں لبھدی تھک تھک جاواں
زیوراں والے لبھدے ہی نئیں میتھوں ہور جھمیلے

اکھیاں دے وچ آ جاندا اے رُخ دا کالا موہکا
نظر کسے نوں آ نہیں سکدا کسے دے ساہ دا ہوکا

میں کاغذ دی اک نکی جئی کشتی وچ جا نکلی
سفنے ویکھن پار سمندر ٹریاں دو اکھاں

سارا شہر جے جوڑاں منگے، کس کھوہ سٹے پکے رنگے

رخشندہ نے نہ صرف اپنے ماضی کو پنجابی شعر میں پرویا بلکہ اردو شاعری کی طرح اس نے عورت کے استحصال اور زندگی کے دکھوں کو بھی موضوع بنایا۔

توے تے روٹی پاندیاں پاندیاں
پھڑدے وچ بال وی ہوندا

کچھ مصرعے ملاحظہ ہوں:

چھجن دے پانی نال نہاتی سونے نال سکھائے وال

عشقاں والیاں نال کمیٹی پا بیٹھی
گھر بالن نہیں اڑیے دس ھن کیہہ چھلاں ول تکاں

گاچی وانگوں میں وی کھر گئی اوہ وی اندروں پھوکا

میں کھلی بانہوں سے اس مجموعے کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

رخشندہ نوید کی شاعری

''نیناں اتریں پار'' رخشندہ نوید کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ انکا پہلا مجموعہ ''پھر وصال کیسے ہو'' 1995 میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے کے فلیپ پر منیر نیازی صاحب نے لکھا تھا۔ 'رخشندہ نوید کی شاعری میں تازگی کی خوشبو ہے جو رواج عام میں لکھی گئی شاعری سے گھبرائے ہوئے دل و دماغ کو خیالوں کی ایک نئی دنیا کی سمت اشارہ کرتی ہے اور قید معمول سے رہائی دیتی ہے۔''

رخشندہ نوید نے اس تازگی کی خوشبو کو اپنے اس نئے مجموعہ تک برقرار رکھا ہے۔ رخشندہ کی غزلوں میں ان کا اپنا انداز محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ رواں بحر میں مسلسل کیفیت کی غزل لکھتی ہیں۔ اس طرح ان کی غزلیں نظموں سے قریب ہیں اور یہ ہی ہمارے عہد کا مزاج ہے۔ مثال کے طور پر ان کے پہلے مجموعہ ''پھر وصال کیسے ہو'' کی پہلی غزل سے ابتدائی دو اشعار دیکھیے:

اب اپنے دوست کی، دشمن کی بھی پروا نہیں ہوتی
میں اپنے ساتھ ہوتی ہوں کبھی تنہا نہیں ہوتی

خود اپنی خواہشوں کو دسترس میں ایسے رکھا ہے
کوئی دیوار پہ لکھ دے اگر رسوا نہیں ہوتی

....

پھر ان کے دوسرے مجموعہ ''کسی اور سے محبت'' سے یہ مشہور غزل دیکھیے:

در و دیوار سے جالا نہیں جاتا اماں
مجھ سے گھر بار سنبھالا نہیں جاتا اماں

فکرِ دنیا ہو کہ عقبیٰ ہو کہ فکرِ فراق
روگ کیسا بھی ہو پالا نہیں جاتا اماں

پاؤں سے ہٹ کے تہہ دل میں اُتر آتا ہے
مندمل ہو کہ بھی یہ چھالا نہیں جاتا اماں

کیسے نکلے گا اندھیروں سے میرے وقت کا چاند
اس کے اطراف سے ہالا نہیں جاتا اماں

....

رخشندہ اپنی اس غزل سے بڑے حلقے میں پہچانی گئیں ہیں لیکن پہلے میں غزل مسلسل کی، جو بات کر رہی تھی۔ اسی حوالے سے ان کے نئے شعری مجموعہ ''نیناں اتریں پار'' کی پہلی غزل سے ابتدائی دو اشعار پیش کر رہی ہوں:

یہ کیسا عشق میں ڈوبا ہوا کردار ہے صاحب
ابھی تک اس کی جھولی میں وہی پندار ہے صاحب

دُبک کر اتنے سارے غم یہاں خاموش بیٹھے ہیں
یہ دل ہے یا کسی صوفی کا اک دربار ہے صاحب

....

ان مثالوں سے آپ کو رخشندہ کی شاعری کے مزاج کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اپنے اظہار کے لیے راہ تلاش کرنا اور پھر اس کے تسلسل کو برقرار رکھنا ان کی فطری طور پر شاعر ہونے کی دلیل ہے۔

رخشندہ پچھلے پچیس سال سے لکھ رہی ہیں۔

فاطمہ حسن

ان کا کہنا ہے کہ یہ پیدا ہی شاعرہ ہوئیں تھیں۔ بہت کم عمر میں شادی کے بعد اپنی تعلیم کی تکمیل (جو کہ ماس کمیونیکیشن میں ایم اے ہے)۔ چار بیٹوں کی پرورش کے ساتھ شعری سفر کو برقرار رکھنا اسی وقت ہی ممکن ہو سکتا ہے جب شاعری زندگی کا حصہ ہو۔

رخشندہ نوید اپنے شوہر کو کریڈٹ دیتی ہیں کہ وہ ان کے شوق کی راہ میں حائل نہیں ہوئے۔ ہمیں ان کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید یہ باصلاحیت شاعرہ اپنی شاعری گھر کی سلامتی پہ وار دیتی ہیں۔

رخشندہ نے بہت اچھی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے انھیں بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ کہا ہے اور ان کے موضوعات کے تنوع کی تعریف کی ہے۔ ایسا بھی ہے۔ رخشندہ کی نظموں میں داخلی اور اجتماعی دکھوں کا اظہار، معاشرتی جبر، منافقت اور خصوصاً عورت کے وہ دکھ جو سماج نے اس کے لیے مخصوص کر دیے ہیں، نمایاں ہیں۔ رخشندہ چھوٹی سی نظم میں بہت سی باتیں بڑی خوبصورتی سے کہہ جاتی ہیں۔ ان کے پہلے مجموعے سے ایک نظم دیکھیے:

"راہ کی پہیلی"

زندگی بھی مشکل تھی
موت کا طریقہ بھی سوجھتا نہ تھا کوئی
راستہ بھی لمبا تھا
راہ کی پہیلی میں بوجھتا نہ تھا کوئی
حُسن کے تعاقب میں
عشق کی تمازت تھی
آس کا سویرا تھا
عشق کے تعاقب میں
ہجرت مسلسل تھی، ہجر کا اندھیرا تھا

اب نئے مجموعے سے تین لائنوں کی یہ نظم سنیے:

"وہم"

کبھی کبھی ایسا لگتا ہے
میں اک کٹھ پتلی ہوں
جنون میرے اندر سے کہیں نکل چکا ہے

رخشندہ نوید کو کم لفظوں میں زیادہ باتیں کہہ جانے کا ہنر آتا ہے۔ یہاں میں اپنا ایک تاثر بیان کر رہی ہوں، جو رخشندہ کی خوبی ہے۔ پہلے آپ ان کی ایک نظم سنیے:

"دوستوں کو ساتھ رکھ"

شہرِ ناپرساں کی گلیوں میں کٹے ہے مہر دن
بے مروت شہر کے رستوں میں شامیں کھل گئیں
اسقدر برسیں چھتوں پر خامشی سے بارشیں
رنجِ دوراں میں پلک کی جھالریں بھی ڈھل گئیں
بند ان سرکش ہواؤں نے کیے جتنے بھی در
دل میں اندر کی طرف کچھ کھڑکیاں ہی کھل گئیں

کام میں آ کر ہواؤں نے مرے از خود کہا
دھوپ گہری ہے درختوں کے تلے آرام لوں
آسماں کے اُڑتے رنگیں بادلوں کو تھام لوں
پھول کلیوں چاند تاروں خوشبوؤں کا نام لوں
تتلیوں، پریوں، پرندوں، ساحلوں کا ساتھ ہو
کوئلوں، چڑیوں، پپیہوں، جگنوؤں کا ساتھ ہو
ساتھ رہنے والے ہر دم دوستوں کا ساتھ ہو

آبشاروں، جھیلوں، جھرنوں کے کنارے گھر بنے
خواہشوں، خوابوں، خیالوں کے سہارے گھر بنے

....

یہ ان کے پہلے مجموعہ کی نظم ہے جس میں منیر نیازی کے اثرات نظر آتے ہیں۔ پہلے مجموعے میں ان اثرات کا ہونا کوئی خامی نہیں بلکہ اس بات کا ثبوت ہے کہ رخشندہ اپنے عصر سے جڑی ہوئی ہیں۔ ایک عہد کا اپنا مزاج ہوتا ہے، جو اس دور کے ادب میں جھلکتا ہے۔ ہم عصروں میں مضامین بھی مشترک ہو جاتے ہیں۔ تاہم تازہ مجموعے میں وہ ان اثرات سے باہر آگئیں۔ اب ان کے موضوعات حیرت اور امکانات کی خوش رنگینیوں سے ہٹ کر حقیقت کی سنگلاخیوں تک آگئے ہیں۔

نظمیں آج، یاد کا گدھ، اتنی سہانی شام، پہلا کپ چائے کا، ان تلخ حقیقتوں کا احاطہ کر رہی ہیں، جو آج کی زندگی کا حصہ ہیں۔
اب میں پھر رخشندہ کی غزلوں کی طرف آتی ہوں، جن میں بہت سے غیر روایتی مضامین ان کی انفرادیت کا پتہ دیتے ہیں۔ چند مثالیں پیش کرتی ہیں:

دیکھنے میں بچپنے کی بات رخشندہ لگے
عشق ڈھلتی عمر میں ہونا جوانی میں نہیں

اور سب کام تہہ کیے سردست
پہلے بیٹی ذرا بیاہ تو لیں

اٹھ بھی سکتی ہے گر کے رخشندہ
یہ تماشائی اپنی راہ تو لیں

اتنا آسان کہاں خود کو بچانا میری جاں
آگ جنگل میں لگی ہو تو بجھانا میری جاں

....

رخشندہ کی غزلوں میں ردیف کا استعمال ان کی غزلوں کو داخلیت سے بہت قریب کر دیتا ہے۔ ایک غزل کی ردیف رخشندہ ہے۔ ایک اور غزل کی ردیف ''میری گڑیا'' پھر ''میری جاں''، ''اماں''، ''صاحب''، جیسی ردیفوں سے انھوں نے غزل میں مسلسل کیفیت پیدا کی ہے اور یہی ان کا اپنا انداز ہے۔

☆☆☆☆☆

جناب شمس الرحمٰن، جناب انور شعور، محترمہ رخشندہ نوید۔

رخشندہ نوید کی غزل: ایک تاثر

محمد حمید شاہد

میں سمجھتا ہوں کہ رخشندہ نوید کی غزل کا مجموعی مزاج ایسا ہے کہ اس میں فکر اہم نہیں رہتی تاہم ایسا بھی نہیں ہے کہ کہیں بھی اس جانب اعتناء کیا گیا ہو۔ وہ سماجی سیاسی صورت حال پر بھی نگاہ کرتی ہیں مثلاً یہ شعر دیکھیں:

کسی دن وہ بھی آخر تھک نہ جائیں
جنازوں پر جنازے ڈھونے والے

یا پھر یہ شعر:

وہ شیریں دودھ کی نہریں، وہ میٹھے میوہ جات
فلک پہ کچھ میرا سامان رکھ لیا گیا تھا

....

پہلا شعر پڑھتے ہی مجھے منٹو کے ''سیاہ حاشیے'' کا ایک افسانچہ یاد آیا تھا، جس کا نام تھا ''آرام کی ضرورت'' صرف چودہ لفظوں کا افسانچہ یوں تھا:

''مرا نہیں، دیکھو ابھی جان باقی ہے''
''رہنے دو یار، میں تھک گیا ہوں''

....

جب قاتل ایک مرحلے پر تھک سکتے ہیں تو جنازے ڈھونے والے بھی تھک سکتے ہیں۔ دوسرے شعر میں بھوک میں پلتے انسان کے ذہن میں بسی ہوئی جنت کو ڈھونڈ نکالا گیا ہے۔ اسی طرح نسائی جذبوں کا اظہار بھی رخشندہ کی شاعری میں ہوا ہے۔ اس اظہار میں جو تصویر بنتی ہے اس میں مرد موجود رہتا ہے بلکہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تصویر عورت یا پھر مرد، دونوں میں سے کسی ایک کے وجود کی منہائی سے بن ہی نہیں سکتی ہے۔

تمہارے ساتھ جس دم تن بدن بارش میں بھیگا
لہو بن کر رگوں میں تھا رواں پانی ہی پانی

....

حتیٰ کہ اس تصویر جہاں یہ صورت ایک کو منہا ہو جانا ہوتا ہے وہاں بھی دوسرے کا وجود ایک سرور بن کر ساتھ رہتا ہے:

اس سے مل کر فقط یہ دیکھنا تھا
کتنے دن تک سرور رہتا ہے

....

رخشندہ نے کہیں کہیں ان موضوعات کو بھی برتا ہے جن میں عورت کی اپنی الگ قامت اور تشخص پر اصرار ملتا ہے۔ تاہم یہ موضوعات گاہے گاہے آئے ہیں۔

رکھا جائے مجھے جنت سے کسی منظر میں
پاؤں کے نیچے ہی جنت کو نہ رکھا جائے
اس کی تکمیل میں شامل ہے میرا پورا وجود
گھر کی تختی پہ میرا نام بھی لکھا جائے

....

جنس کا موضوع بھی رخشندہ کی شاعری کا حصہ ہوا

ہے تاہم اس موضوع کو برتتے ہوئے کہیں بھی اس کا شعر اُتھلا نہیں ہوتا، بلکہ خیال کی نئی جہت کو سامنے لاتا ہے۔ مثلاً دیکھیے اس شعر میں مہکنے والے باغات، وہ نہیں رہتے جو ہمارے دیکھے بھالے ہیں، یہ انسانی بدن کی تطہیر ہوگئے ہیں:

خیال یار کی برکت ہے ورنہ
مہکنا چھوڑ دیں باغات میرے

ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

وصل کی اس کرامت پہ حیران ہوں
ایک پل میں کلی پر شباب آ گیا

یا پھر یہ شعر دیکھیں:

ایسے ہم لوگ مل نہیں سکتے
جیسے پانی ملا تھا پانی میں

....

میں نے محسوس کیا ہے کہ رخشندہ نوید کا مرغوب علاقہ غزل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری شاعرہ کی کتاب ''خامشی کو سن رہی تھی، میں نظموں کی ایک معقول تعداد بھی موجود ہے، ان کی کئی نظمیں مجھے اچھی بھی لگیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ اپنی غزل کے حوالے سے ہی وہ ہمیں متوجہ بھی کرتی ہیں۔ جی اپنی غزل کی وجہ سے، جس میں وہ اس صنف سے کھلواڑ کیے بغیر، اپنے اظہار کی گنجائشیں نکالتی ہیں اور اپنے لیے غزل میں وسعتیں بھی ڈھونڈ نکالتی ہیں۔

رخشندہ نوید نے اپنی کتاب کا نام جس شعر سے نکالا گیا ہے، صاحب کیا خوب شعر ہے:

میں اُس کی خاموشی کو سن رہی تھی
وہ اظہار محبت کر رہا تھا

اظہار محبت کے مقابلے میں خامشی کو سننے کا خیال نہ صرف شاعرہ کے ہرے بھرے تخیل کو نشان زد کرتا ہے، اس گہرے حسی شعور کی سمت میں اشارے فراہم کرتا ہے جو انسانی تعلقات کی لطیف سطحوں سے اور انہی گہری لطیف سطحوں پر معاملہ کرتے ہیں۔ اچھا یہیں ایک اور شعر دیکھیے:

اُٹھا کر طاق سے گلدان رکھ لیا گیا تھا
دوبارہ ملنے کا امکان رکھ لیا گیا تھا

....

ان دونوں اشعار میں بظاہر پہلے اور دوسرے مصرع کے بیچ ایک فاصلہ موجود ہے اور یہ فاصلہ ایسا ہے جو مفہوم کے اعتبار سے کہیں نہیں ہے، مگر لفظوں سے جو تصویر بن رہی ہے اس میں ہے۔ فصل کی ایسی موجودگی اور غیاب سے ایک جمالیاتی بعد نے ظہور کیا ہے۔ کتاب کھولتے ہی رخشندہ کی شاعری نے اگر میری توجہ حاصل کی تو اس کا سبب یہی پہلا قرینہ تھا، ایک ایسا قرینہ جس میں مفہوم بہتا ہوا دوسرے مصرع کے پیالے میں ایک دم نہیں گرتا، ذرا توقف کرتا ہے، اسی سے سنی جانے والی خاموشی اور محبت بھری گفتگو میں ایک نسبت پیدا ہوئی ہے اور طاق سے اُٹھا کر سنبھال کر کھ لیے جانے والے گلدان کا تعلق اس امید اور خواب سے جُڑ گیا ہے، جس میں دوبارہ ملن کا امکان موجود ہے۔

ایک اور خاص وصف جو اس شاعرہ کو توجہ سے پڑھنے کی طرف مائل کرتا ہے وہ اپنے شعری تجربے میں اپنے

اردگرد کی زندگی کو باریکی سے برتنے کا عمل ہے۔ یہ ایسی باریکی ہے جو محض خیال یا خواب نہیں رہ جاتی، جذبے کا تعلق کی ایسی جہت بن جاتی ہے جو کسی منظر میں ہی کلام کیا کرتا ہے۔ ایک مثال جذبے کی شدت کے باب میں، جذبے کی شدت جو شعر مکمل ہوتے ہی ایک منظر سے پھوٹ پڑتا ہے۔

ایک شب، شاہزادے نے رکھے تھے لب
اک نشاں مرمریں ہے، مرے ہاتھ پر

....

دیکھا جاسکتا ہے کہ اس شعر میں بھی شاعرہ نے خیال کو یا مشاہدے کو سیدھے سبھاؤ بیان نہیں کیا اس میں ایک لطیف سا لطف رکھ دیا ہے۔ وہ دوسرے مصرع پڑھتے ہی مرمریں نشان ہو کر جذبے کی ایسی شدت شعر سے چھلک پڑتی ہے جو زبان کو محض مضمون کا سانچہ یا کھانچہ نہیں بناتی، شعر کی اپنی جمالیات بھی مرتب کرتی ہے۔

ایک اور بات جو رخشندہ کی غزل کا اختصاص بن سکتی ہے، وہ ہے عام فہم زبان کا استعمال۔ شاعرہ نے غزل میں بالعموم رواج پا جانے والے لفظی مرکبات ہی کو برتا ہے۔ زبان کے ایسے برتاؤ میں آپ لسانی تجربے کی قوت یا تعجب سے قاری کو متوجہ کرنے یا چونکانے کے حیلوں کو کھو بیٹھتے ہیں، لطف یہ ہے کہ رخشندہ کے لیے قاری کو یوں متوجہ کرنا یا چونکانا کبھی بھی مقصد نہیں ہوا ہے، ان کی شاعری کا اور مقصد کیا ہے؟ محض اور صرف مشرقی نسائی جذبوں کا بیان؟ جی نہیں، یہ اور نہ ہی وہ احتجاجی لحن، جو فیمنسٹ شاعرات کا وطیرہ رہا ہے۔ تو پھر کیا، شاید وہ سب کچھ، جو بحیثیت انسان اس کی دسترس میں ہے، یا پھر اس کی دسترس میں نہیں ہے، جی اسی رسائی اور نارسائی سے جو زندگی متشکل ہوئی ہے، اسی زندگی کی عمومی سطح سے شاعرہ نے اپنے تجربے کی جہت کو اپنے شعر میں برتا ہے، شاعرہ کے اپنے تجربے انکشاف کی سطح پر بیان ہی یہاں رخشندہ کی غزل کا جواز اور مقصد بنتا رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

جناب سحر انصاری، جناب محمود شام، محترمہ رخشندہ نوید۔

رخشندہ نوید ___ ملنگنی تخلیق کار

ہر تخلیق، اپنے تخلیق کار کے من کی سچی تصویر ہوتی ہے، جو کوئی دوسرا نہیں اُسکی اپنی لکھی تحریر بتاتی ہے۔ مجھے نہیں یاد، یہ کتاب مجھے شاعرہ نے کب دی۔ شاید وہ اک کانفرنس میں اُسے رکھ کے چپ چاپ چلی گئی۔ اُس نے بات کی ہوتی تو وہ یاد رہتی۔

کئی دنوں بعد، کتاب کھولی اندر پورا کلچرل میوزیم نکل آیا۔

شاعری کی نازک کمر، ثقافت، تہذیب اور تمدن کے تیکھے ست رنگی بھاری پتھر اٹھانے کے لیے بنی تو نہیں مگر اُس نے بنا لی۔

کہیں وہ وطن پر مرمٹنے والی مجاہدہ لگتی ہے۔ وہ کہتی:

بھول نہ جانا
اس کی اک اک دیوار کی اینٹ میرے
پرکھوں نے اپنی کمر پہ گارے مٹی لاد
کے کھڑی کی ہے
یہ وہ فصیل ہے
جس میں بنانے والے لاکھوں
خود چنے گئے
دیکھ اس کا تقدس

وہ دیس کے بچوں کو کہتی ہے:

کوئی رکر جائے
قدم قدم چلتا چلتا
تو منہ کھول کے ہنسا نہیں کرتے
اُسے بڑھ کے اٹھاتے

کبھی وہ خبردار کرتی

بچو، بچ جاؤ'' اُس زہریلے سانپ سے، جو مٹی کا بھیس بدل کے، مٹی رنگ میں رنگا ہماری ہی آستینوں میں پلتا ہے

وہ صدیوں سے چلتی آئی، ریتوں، رواجوں کی بات بھی کرتی۔ پرانے غلامی کے دور کے کمہاروں کا پیٹ چاک کر کے، پھر سے انھیں چاک پر چڑھا کے نئے رنگ اور آہنگ دیتی۔

نئی قدروں کو جنم دیتی

اُس نے وہ سارے موضوع چھیڑے ہیں، جو سقراط کے زہر پینے سے حسین کی گردن کٹانے تک انسانیت کا چہرہ مسخ کرتے رہے۔ اُس نے آج کی بچی، لڑکی، عورت سب کا زرمیہ لکھا ہے:

احساسات کی شدت
موضوعات کی رنگارنگی
مشرق کی وزڈم

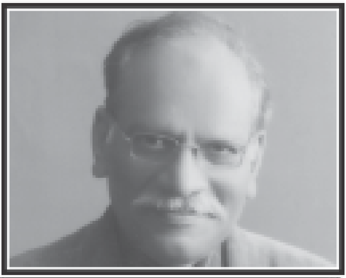

ابدال بیلا

چلتی آتی پرم پرا
سب کی بات کی
احتجاج جہاں بنتا تھا، کیا
فلسفہ نفسیات کی راج گدی کی ساری
راہداریوں سے واقف۔ عورت بن کے
جب وہ کہتی ہے
''اتنی جلدی نہ کر
آگ ذرا کم کر
ذائقوں میں لذت خوشبو لانی ہے تو
پہلے ایک کام کر
مجھ کو پانی کر (ترجمہ)
ایسے نازک کول موضوع پر ہماری مشرقی
زبانیں گونگی ہیں۔ کسی نے ان پہ منہ کھولا
نہیں، پھر وہ بھی ایک لڑکی:
ایسا ہوا نہیں تھا
مگر ہو گیا
میں نے ذہن پہ بہت زور دیا، شاعرہ نے اپنی یہ
پنجابی کتاب مجھے کب دی؟ مجھے یاد نہیں آتا وہ
لمحہ، کتاب پیچھے چھپی تصویر سے پہچان گیا۔
اوہ، یہ تو شاید وہی ہے۔
''پیش لفظ'' میں اس نے اپنا بھید کھولا ہے،
سنت نگر، میرے گورنمنٹ کالج لاہور کے
رستے میں ہی تھا، سائیکل پہ جاتے جاتے
اُدھر سے یاد آتا ہے۔ راہ میں اک شور اُٹھا
رہتا، ایک بار:
اوہ، پکڑو''
دیکھو
نالے میں کوئی چھوٹی سی بچی گر گئی ہے
میں نے پیڈل روک کے، زمین
پہ پاؤں رکھ کے اُدھر گردن موڑی تھی
مجھے لگتا ہے
لوگ اُس پٹولا سی تین سالہ بچی کو پکڑ کے ہینڈ
پمپ کے نیچے مَل مَل کے دھو رہے تھے
گرتے پانی کی بوندوں سے اجالا اُس کے
چہرے سے اگنے لگا تھا۔ ابھرنے لگا تھا۔
حیرت ہے۔
انھوں نے اسے دل سے دھویا
کہ پایاب
اندر سے دودھ کا چشمہ بن کے اُبل پڑی،
یہی ہے وہ
میں جان گیا
اُس وقت تو یہ بچی ملنگنی سی تھی
اب اسے لوگ ''رخشندہ نوید'' کہتے ہیں۔
میں نے تو اسے صرف اُسی وقت دیکھا تھا۔
لگتا ہے۔
اُبلتا چشمہ اب اس نے اپنے اندر اچھال لیا ہے۔
پانچ کتابوں کی مصنفہ ہے، مگر بچپنے کی معصومیت
اور حیرت، بہتے پانی کی رو میں اس نے بہنے نہیں
دی۔ گم نہیں ہونے دی۔ مجھے لگتا ہے، شاعری
کے ساتھ اگر اس نے نثر کی موٹروے پہ قدم رکھا
تو اس کی تخلیقی قوت کی رفتار بڑھے گی۔
ابھی بھی دیکھا تو نہیں اسے لیکن، گمان ہے
یہ وہی ہوگی، ملنگنی سی اب بھی۔

☆☆☆☆☆

رخشندہ نوید کی شاعری

حُسن کے لیے احساسِ حُسن کا بیدار ہونا دو متضاد رویے پیدا کرتا ہے۔ اول: انانیت، خود پسندی اور خود غرضی اور دوم: عجز، چاہت اور دردمندی کا۔ ہر دو رویے اپنی انتہا آپ ہیں اور زندگی کی رونق میں ایک تسلیم شدہ حقیقت کے طور پر اپنا وجود رکھتے ہیں۔ فنون ادبیہ میں ان کی شدت کچھ اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ تاہم یہاں یہ لاوہ ذات کی بھٹی میں تپ کر اور فن کی محنتوں سے چھل چھلا کر آبدار بنتا ہے۔ اردو شاعری کی روایت احساسِ حسن کے ہر دو رویوں سے بھری پڑی ہے اور مختلف ادوار میں ان کے متنوع زاویوں کو مصور کیا جاتا رہا۔ جدید عہد میں اس کا خوبصورت اظہار رخشندہ نوید کی شاعری ہے۔ رخشندہ نوید کا احساس ثانی الذکر رویے میں ڈھلتا اور عجز، چاہت اور دردمندی کی صورت میں زندگی کے وسیع تر دائروں میں مسلسل پھیلتا دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے انانیت، خود پرستی اور خود غرضی کی دھند سے ہٹ کر اپنے لیے یہ راستہ تلاشا اور عمر بھر اس پر سختی سے کاربند رہیں۔ دیکھا جائے تو ان کی تمام تر شاعری اسی احساس کے مختلف ہیولوں کی تصویر کشی اور اس کے امکانات و نشانات کی مصوری سے عبارت ہے۔

رخشندہ نوید کا اولین شعری مجموعہ "پھر وصال کیسے ہو" دوسرا "کسی اور سے محبت" اور تیسرا ابھی تو نہیں - نیناں اتریں پار ہے - ان مجموعوں پر اگرچہ ایک نظر ہی رخشندہ کے شعری مزاج کو پہچاننے کے لیے کافی ہے لیکن تنقیدی نقطہ نظر سے ضروری ہے کہ چھونے کے بجائے کریدنے کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ صرف اسی صورت میں حرف حرف بکھرتی سمٹتی رخشندہ کی فکر اور فنی قد کاٹھ تک رسائی ممکن ہے۔ تنقید کا مقصد کچھ لوگوں کے نزدیک عیب نکالنا ہے۔ کچھ اسے تحسین و تردید سمجھتے ہیں اور کچھ اس کی حیثیت فن اور فنکار کو سمجھنے کے حوالے سے مرتب کرتے ہیں۔ میں یہاں فیصلے صادر کرنے کے بجائے آخری الذکر کو محاکمائی حربے کے طور پر استعمال کروں گا تاکہ رخشندہ کی شاعری کے اختصاصی پہلوؤں کو سمجھا سمجھایا جا سکے۔

"پھر وصال کیسے ہو" کی شاعری موضوعاتی اعتبار سے ایک جواں سال لڑکی کا حقائق کی دنیا سے ایک تلخ تعارف ہے۔ کہانی کا آغاز منہ پر دانے نکلنے کے دن ہیں۔ شاعرہ کے لفظوں میں:

جواں رت تھی پھر افسانے بھی نکلے
مرے منہ پر بہت دانے بھی نکلے

شفیق انجم

ان دنوں کے بے مہار جذبے، دھیرے زور پکڑتی انجانی خواہشیں، وجود کی تتلی کی پھڑ پھڑاہٹ اور رسوائی کا ڈر، یہ سب کچھ شعروں کے قالب میں ڈھلتی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

روبرو اک اونچا ور تھا، تجھ کو کیا تھا
مجھ کو رسوائی کا ڈر تھا، تجھ کو کیا تھا
اے ہوا رکتی ذرا پھولوں میں تو ہی
موڑ پہ میرا تو گھر تھا، تجھ کو کیا تھا

....

لڑکی سوچتی ہے اُس کے بارے میں جسے وہ محسوس تو کرتی ہے، مل نہیں سکتی۔ جب رات بکھرتی ہے، پھول کھلتے ہیں، چاند اُبھرتا ہے، وہ سوچتی ہے اور سوچے ہی چلی جاتی ہے۔ سوچتی ہے کہ:

کیا اس کا دل نہیں کرتا
رات کے بکھرنے پر
چاند کے نکلنے پر
پہلا پھول کھلنے پر
اور مجھ سے ملنے پر
چاندنی کی باہوں میں
جھیل کے کنارے پر
محوِ رقص ہو جائے
اور ایک نقطے میں
کائنات کھو جائے

محبت کا کومل جذبہ فطری حسن کے ساتھ اُمڈتا ہے۔ احساس بیدار ہوتا ہے اور شرمیلی آنکھوں میں سپنے آبسیرا کرتے ہیں۔ یہاں اور کچھ نہیں بس تمہی کو تک دیکھتا اور دیکھے چلے جانا اہم ہے۔ لکھتی ہیں:

ہم اس کی سمت محبت سے دیکھنا چاہیں
نہ گفتگو، نہ خواب و خیال کی خواہش

....

پھر وصال کیسے ہو

''پھر وصال کیسے ہو'' میں اندر کی ساری تھکاوٹ اُتر آئی ہے۔ کہانی یہاں ختم ہوتی ہے تاہم ضروری نہیں یہ کہانی رخشندہ نوید ہی کی ہو۔ یہ تو ایک شاعرہ کا وجدانی عمل ہے، جو موجودہ عہد میں اپنی ہم جولیوں کی زندگی کے عمومی چلن کو لمحہ لمحہ فوکس کر رہا ہے۔ جوانی کی اُبھرتی شوخیوں سے سفر آغاز کرنے والی ایک حسیناؤں کے فطری جذباتی، جنسی، جبلی اور نفسی لہریوں محسوس کرنا، عہد بہ عہد اس کے تغیر پر نظر رکھنا اور پھر مہارت کے ساتھ اس اتار چڑھاؤ کو بیان کرنا یہاں اہم ہے۔ رخشندہ کا لب ولہجہ اس پر دال ہے کہ یہ سب کچھ انھوں نے ایک بھرپور شعوری کوشش کے تحت کیا۔ یہ ایک بالکل نئی اور اچھوتی روایت ہے۔ اگرچہ اردو شاعری میں نفس انسانی کے مختلف زاویوں اور ان کے پیچ وخم کو بیان کرنا کچھ ایسا نیا نہیں۔ لیکن ایک غیر محسوس انداز، وضع داری، اور تمام تر احساسات وجذباتی گہرائی کے ساتھ ایک جواں سال لڑکی کی نرم گرم کہانی کہنا، نیا بھی ہے اور اچھوتا بھی۔ رخشندہ نوید کی انفرادیت یہی ہے کہ اس نے عورت کے المیے کو بڑے قریب سے فوکس کیا ہے۔ اتنے قریب سے

کہ گرم سانسوں کی حدت، جوانی کا جوش اور آخر میں ڈھلکتے آنسوؤں کی تپش پوری شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔

"پھر وصال کیسے ہو" میں رخشندہ نوید کا تصور عورت تشنہ دریا کی ریتلی آنکھوں سے مماثل ہے۔ ان آنکھوں کا بنیادی مسئلہ بارش کے دو قطرے نہیں، طوفان باد و باراں کی خواہش ہے۔ ٹوٹ جا چاہنے اور چاہے جانے کی اس خواہش ہی سے اس کے نفسیاتی احوال مرتب ہوتے ہیں۔ اوائل جوانی سے ڈھلتی عمر کے سایوں تک وہ مسلسل اسی بند ڈبے میں لڑھکتی رہتی ہے۔ کبھی مذہب کے نام پر، کبھی روایات اور اقدار کے نام پر اور کبھی عزت و وقار کے نام پر وہ اسیری کے دن بھی کاٹتی ہے اور کسی کی الماری میں تصویر کی طرح بند رہنا بھی گوارا نہیں کرتی ہے۔ لیکن جب کبھی بھولے سے اپنی زفطری آزادیوں کی تسکین کو دل مچلتا ہے تو تماشا بن جانا بھی اس کا مقدر ٹھہرتا ہے۔ یہ ایک پابند معاشرے میں عورت کی مجموعی قسمت ہے۔ رخشندہ نوید عورت کے انہی المیوں کی شاعرہ ہیں۔ جذباتیت اور رومانیت محض کو اختیار کیے بغیر انھوں نے حقیقت پسندانہ انداز میں عورت سے وابستہ ان تلخ منظروں کو لفظوں کے شیشے میں اتارا ہے۔ اس سلسلے میں تجربے کی مٹھاس بھی ان کی معاون بنی اور خواب جیسی راتوں میں الجھی الجھی باتوں کو مسلسل سوچنا اور کھوجنا بھی۔ وہ خود لکھتی ہیں:

گزشتہ کہانیوں کا بقیہ
ڈھونڈنا پڑا مجھ کو
مختلف کتابوں میں
اجنبی علاقوں میں
بکھرے بکھرے پتوں میں
دل کے بند خانوں میں
کھو چکے زمانوں میں
وقت کے حسابوں میں
مختلف کتابوں میں
کھوجنے پڑے مجھ کو
ماہ و وصال جیون کے
ریزہ ریزہ ٹکڑوں میں
ڈھونڈنے پڑے مجھ کو
اپنی ذات کے حصے
کچھ خیال ماضی کے
کچھ چھپے ہوئے قصے
الجھی الجھی باتوں میں
خواب جیسی راتوں میں

"پھر وصال کیسے ہو" میں پیار بھری انگڑائیوں سے شروع ہونے والا سفر جگراتوں پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ گڑیا کا معصوم چہرہ گھمبیر سناٹوں میں گھرتا دکھائی دیتا ہے اور کمند یہاں ٹوٹتی ہے کہ:

خواب کے بکھرے خیالوں کی چبھن جاتی نہیں
رات بھر سونے سے بھی اپنی تھکن جاتی نہیں

....

تھکن کا یہ شدید احساس ظاہر اور باطن ہر دو سطحوں پر جھلکتا اور بے یقینی و انتشار کے ایک مسلسل عمل میں

ڈھلتا نظر آتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی رخشندہ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کی نظموں کے موضوعات میں تنوع ہے۔ اس تنوع میں اس کے باطن کی ترجمانی بھی ہے اور خارج کی عکاسی بھی۔ اس عکاسی میں عورت کے گھریلو مسائل کے علاوہ معاشرتی انتشار، سیاسی بے یقینی اور مستقبل کی گومگو بھی کارفرما ہے اور سب مسائل کے بارے میں شاعرہ کا اپنا رویہ اور نظریہ بھی، جس پر کہیں اثبات کی روشنی پڑتی ہے اور کہیں المیہ کی دھند چھا جاتی ہے۔"

احمد ندیم قاسمی - (فلیپ)
"پھر وصال کیسے ہو"

منیر نیازی رخشندہ نوید کو جدید اردو شاعری میں ایک پرکشش اضافہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک:

"اس کے موضوعات روشِ عام سے ہٹے ہوئے اور ان کی تفصیلات کے بیان کا انداز مختلف ہے۔ رخشندہ نوید کی شاعری میں تازگی کی خوشبو ہے جو روشِ عام میں لکھی گئی شاعری سے گھبرائے ہوئے دل و دماغ کو خیالوں کی ایک نئی دنیا کی سمت اشارہ کرتی ہے اور قیدِ معمول سے رہائی دیتی ہے۔"

منیر نیازی __ (فلیپ)
"پھر وصال کیسے ہو"

"کسی اور سے محبت" رخشندہ کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ "پھر وصال کیسے ہو" کی کہانی یہاں ختم ہوتی ہے، وہیں سے "کسی اور سے محبت کا" کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں رخشندہ کی ہیروئن بازی ہار جانے کے بعد ابتلائے غم کے مختلف مراحل سے گزرتی ہے۔ پہلی ہی غزل اعتراف شکست اور ہار کا نوحہ لیے ہوئے ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں:

بات جو بھی دل میں ہے اظہار کی تو آئے گی
دور کی گہری چبھن گفتار میں تو آئے گی
ہار کر خود کو میں چپ ہو جاؤں گی تیرے حضور
جیت کر اک سرخوشی سرکار میں آئے گی
تیز بارش میں بہت بھیگی ہے میرے دل چھت
کچھ نمی آخر در و دیوار میں تو آئے گی

روپہلی رنگت، شوخیاں، دلداریاں کملا کے یوں پتی پتی ہوئیں کہ پھر کچھ باقی نہ بچا۔ اب لڑکی کے پاس فقط ایک ہی سرمایہ ہے اور وہ ہے درد۔ درد کہ جو نقطہ نقطہ پلکوں سے بہتا ہے اور حرف حرف پھیلتا چلا جاتا ہے۔ حالت یہ ہوتی ہے کہ:

آئینے سے پوچھتی ہوں کیا ہوا آخر تجھے
کیا ہوئی رنگت روپہلی، شوخیاں، دلداریاں
اب تو واضح ہو چلے رخشندہ، ان آنکھوں سے
گہرے حلقے، بھیگی بھیگی آنسوؤں کی کیاریاں

"کسی اور سے محبت" میں رخشندہ کا محبوب استعارہ 'رات' ہے۔ رات کہ جو اپنے اندر سب کچھ سمیٹ لیتی ہے مگر کچھ اگلتی نہیں۔ وصل، ہجر، درد، آنسو، رات کی گود میں جھکتے جھکتے جوان ہوتے ہیں اور پھر اسی گود ہی میں

کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ شاعرہ نے اس استعارہ کو متنوع معانی پہنائے ہیں اور مختلف زاویوں سے اسے دیکھا دکھایا ہے۔ ان کی ایک نظم عنوان ہے 'رات مجھے اچھی لگتی ہے' یوں نظم دن کی تلخیوں سے دور رات کی گود میں اُتر جانے اور سکون یا جان کی تمنا سے عبارت ہے۔ لکھتی ہیں:

رات، اے رات
رات مجھے اچھی لگتی ہے
رات بھی تو ختم نہ ہو
تری صبح کبھی نہ آئے
دن کی جلتی دھوپ
میرے جیون آنگن میں
پل پل کانٹوں ہی کے ہار بچھائے
تری صبح کبھی نہ آئے

عورت کی نفسی کیفیات کے حوالے سے دیکھا جائے تو 'رات' کی حقیقت واضح تر ہو جاتی ہے۔ رات اس کی جبلت کے لیے تسکین ہے ۔ اس لمحۂ تسکین کا وہ دن بھر انتظار کرتی ہے۔ کسی کے لمس کا احساس اور اس لمس میں گم ہو جانے کی خواہش رات کو سرچڑھ کر بولتی ہے۔ کس کے پہلو میں یہ خود سپردگی، محویت اور لطف رات کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ رات عورت کے لیے تعبیر ذات کی علامت بھی ہے اور تخلیق حیات کی بھی۔ ہجر اور وصل ہر دو صورتوں میں رات کے سحر سے عورت کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتی۔ رخشندہ نوید نے رات کا استعارہ اختیار کر کے عورت کے اس پہلو کو فوکس کرنے کی سعی کی ہے۔ یہاں رات کرب سے بھی عبارت ہے اور سرخوشی و سرمستی کی علامت بھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پتے سڑکوں پر بکھرے ہیں
میں ہوں رات کا سناٹا ہے
کیسی پھول سی رات کٹی ہے
کتنا بھاری دن گزرا ہے

اس لمحہ ویران میں چپ چاند، نظر چپ
اک رات کی حیرت میں گرفتار نگر چپ

رات کی طرح رخشندہ نے دریا، پیاس، آسمان، سفر، خواب، چراغ، چاند، نیند اور شام کے استعاروں کو بھی عورت کی نفسی گرہ کشائی میں خوب خوب استعمال کیا ہے۔ محبت اور وفا میں تشنگی اور لاحاصل کے کرب میں مبتلا عورت اپنے متنوع جذبوں، خواہشوں اور احساسات و محسوسات کے ساتھ استعاروں میں اترتی محسوس ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں رخشندہ کی فنی ہنرکاری کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

میں ساحل دریا سے کھڑی دیکھ رہی ہوں
ساکن ہے ہر اک لہر تو ہر ایک بھنور چپ

آخر شب جل بجھے مہتاب و انجم کے چراغ
ایک آنسو نوک مژگاں پر چمکتا رہ گیا

میں تھی تنہائی تھی، اور ماہ مبیں تھا
شام غم اتنی اکیلی تو نہیں تھی

☆☆☆☆☆☆

YouTube Chanal
Urdu stories by rakhshi

کراماً کاتبین

رخشندہ نوید

پیارے بچو! آج پھر رخشی آپی آپ کے لیے ایک مزے کی کہانی لے کر حاضر ہوئی ہیں۔ بچو یہ کہانی ایک پانچویں جماعت کے طالبعلم کی کہانی ہے۔ بہت ہونہار، جماعت میں سب سے آگے بیٹھنے کا شوقین پھرتیلا اور شوخ بچہ تھا۔ وہ سب سے پہلے کلاس میں اپنا کام مکمل کر کے ٹیچر کو دکھانے کا عادی تھا۔ یہ بچہ جس کا نام رضا حسین تھا جماعت میں سب سے زیادہ سوال کرنے میں بھی پیش پیش رہتا تھا۔ وہ کسی بھی نئی بات کی تہہ تک جلدی سے پہنچنے کی کوشش میں اپنے اساتذہ اور والدین کو ہر دم سوالات کی بوچھاڑ سے تقریباً پریشان کر دیتا!! اس کا ہمیشہ سے ایک مسئلہ رہا تھا کہ وہ اپنی عمر سے بڑی باتیں سوچتا، ان پر غور کرتا، پھر خود سے الجھتا اور اس موضوع پر معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنی امی کا سر کھاتا۔ بہت سے سوالات کے جوابات اس کے ذہن تک امی کے ذریعے پہنچتے یا اپنی کتابوں کے مختلف ابواب سے متعارف ہوتا تھا۔ نئے موضوعات کے بارے میں جاننے کی کوشش میں اس کے ذہن کی چرخی تیز تیز گھومنے لگتی اور وہ جب تک اپنی مکمل تسلی نہ کر لیتا اسے چین نہ پڑتا تھا۔ بلکہ وہ بے تاب ہو جاتا۔

ایک روز بچو! اس نے اپنی اسلامیات کی کلاس میں ان کے بارے میں سبق پڑھا تو وہ تو جناب کرسی سے اُچھل اُچھل کر اپنے ٹیچر سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگا اور اس نے فوراً کہا "ٹیچر یہ کیسے ہو سکتا ہے" یہ کیسے ممکن ہے۔ اس کی ٹیچر نے جب ان کو اللہ تعالیٰ کے دو پاک فرشتوں کے بارے پڑھایا اور مکمل تعارف کرواتے ہوئے ٹیچر نے بہت احسن طریقے سے رضی کے ذہن میں اٹھتے سوالات کے جواب دیے مگر کلاس کے ختم ہونے تک رضی کی آنکھیں پھٹی رہیں اور وہ اپنے ساتھ بیٹھے دوست کی طرف بار بار دیکھتا، اپنے کندھے اُچکاتا، حیرت کے دریا میں غوطے لگاتا رہا۔

گھر پہنچ کر روز کی طرح وہ سیدھا باتھ روم میں گھس گیا اور لگا سوچ بچار کے دھوئیں میں اڑنے۔ وہ خود سے سوال پر سوال کرتا رہا۔ ٹیچر سے پوچھ لینے کے بعد بھی اس کی سوئی اٹکی ہوئی تھی۔ اس نے روزانہ کی طرح بڑبڑاتے ہوئے خود سے باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ نلکے کی آواز سے بہتے پانی کے شور میں اس کی کمنٹری اکثر جاری رہتی تھی۔ آج بھی وہ باتھ روم کے شیشے میں خود کو دیکھ دیکھ کر شکلیں بنا بنا کر بول رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے مجھے تو کبھی کوئی بوجھ اپنے کاندھوں پر محسوس نہیں ہوتا۔ پیارے اللہ تعالیٰ جی آپ نے انسانوں کے اعمال لکھنے کے لئے دو فرشتے پیارے فرشتے معمور کر

رکھے ہوئے ہیں جو ہر وقت ہمارا اعمال نامہ تحریر کرتے رہتے ہیں ہر لمحہ، ہر وقت ہم جو بھی کرتے ہیں اچھا برا وہ اسے محفوظ کر رہے ہیں۔ رضا حسین حیرت کے دریا میں غوطے کھا رہا تھا۔ یکدم اسے اپنے کندھے بھاری بھاری لگنے لگے۔ اس نے کپڑے بدلتے ہوئے شیشے میں دیکھنے کی کوشش کی کہ کیا اس کے کاندھوں پر ان پاک فرشتوں کی کوئی شبیہ بھی ابھرتی ہے۔ پھر اسے یاد آ گیا کہ فرشتے تو نور ہیں۔ وہ دکھائی نہیں دیتے۔ اس نے باتھ روم میں تولیے سے منہ صاف کرتے ہوئے اپنے سر کو ہلایا۔ اور کمنٹری جاری رکھی۔

باہر روزانہ کی طرح رضی کی امی کھانا گرم کر کے اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ انھیں معلوم تھا رضی آج پھر کسی کمنٹری میں مصروف ہو گا۔ انھوں نے باتھ روم کے باہر آ کر آواز لگائی ''رضی فلم ختم ہو گئی ہے تو باہر آ جا۔ باقی سب باتیں شام کی شفٹ میں کر لینا۔''

دروازہ پیٹنے پر رضی نے دروازہ کھولا اور خاموشی سے کھانے کی میز پر آ گیا۔ اس کی خاموشی سونگھ کر اس کی امی نے ہنس کر کہا ''کیا ساری باتیں باتھ روم میں ہی ختم ہو گئیں۔'' ''کیسا گزرا آج کا دن؟ سائنس کے ٹیسٹ میں کتنے نمبر آئے؟'' رضی نے امی کی بات کا مختصر سا جواب دیا اور ایک دم اس موضوع پر آ گیا جس نے اس کے ذہن میں کھلبلی مچا رکھی تھی۔

اگلا نوالہ منہ میں ڈالنے سے پہلے اس نے اپنا ہاتھ روکا اور آنکھ کراتی کے پاس آ کھڑا ہوا اور سرگوشی میں بولا امی! کیا آپ کا اعمال نامہ بھی لکھا جا رہا ہے؟ آپ کی بھی سب باتیں اور کام محفوظ ہو رہے ہیں؟ امی نے اس کے دونوں ہاتھ پیار سے تھام لیے اور ہنستے ہوئے بولیں، '' تو کیا آج اسلامیات کے پیریڈ میں وہ سبق پڑھا ہے جس میں کراماً کاتبین کا ذکر ہے۔ ہمارے دو اہم ترین فرشتے جو ہر انسان کے تمام قول و فعل رجسٹروں میں درج کرتے ہیں۔'' جی جی، رضی حیرت سے منہ کھولے کھڑا تھا۔

امی نے کہا کھانا کھاؤ میں بتاتی ہوں۔ وہ اس کی باتوں کو دلچسپی سے سنتی رہیں اور ڈھیرے ڈھیرے ان کے جواب دیتی رہیں۔ رضی نے پوچھا اگر ہمارے دائیں بائیں کاندھوں پر فرشتے موجود ہیں تو ہمیں ان کا بوجھ کیوں محسوس نہیں ہوتا؟ پھر پوچھا وہ اتنا سب کچھ، سب کے بارے میں کیسے لکھ لیتے ہیں؟ پھر انھیں کیسے ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں رجسٹروں میں بھرتے ہیں؟ تو امی نے اسے بڑی اچھی مثال دے کر سمجھایا کہ دیکھو رضی! ہمارے کمپیوٹر، ہمارے فون، ہماری USB یا پھر ایک چھوٹی سی چپ میں ہم کتنا مواد محفوظ کر لیتے ہیں۔

رضی کی امی نے کہا، '' قادر مطلق کے وضع کردہ نظام اور انتظام کامل ہیں جن سے انسان واقف نہیں ہے۔ یہ دونوں فرشتے ہر انسان کا اعمال نامہ تیار کرتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے روز جزا کسی بڑی سکرین پر ہر شخص کا ریکارڈ شدہ ڈیٹا اوپن کیا جائے اور وہ اس کو دکھایا جائے کہ دیکھو تم نے دنیا میں اتنے فی صد اچھے کام کیے اور کتنے فی صد برے کام۔''

لیکن امی جی میں تو روز منصوبے بناتا ہوں، وہ جو سیکشن ریڈ کے لڑکے ہیں ان کے ساتھ کرکٹ کھیلوں گا تو زور سے گیند ان کے منہ

پر دے ماروں گا۔ "شش شش" اس کی امی نے رضی کے ارادے سن کر کہا۔ انھوں نے بھی تو جان بوجھ کر فٹ بال کھیلتے ہوئے میرے آگے پاؤں رکھ کر مجھے بری طرح گرایا تھا۔ ماما نے کھانا ختم ہونے پر اسے میز سے اُٹھایا اور اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کمرے میں لے گئیں اور بتاتی بھی رہیں، دیکھو رضی ایک مزے کی بات ہے، اس نظام قدرت میں آپ جب تک کوئی برائی کر نہیں لیتے، صرف برائی سوچتے ہو یا برے کام کا ارادہ بناتے ہو تو اس کا کوئی گناہ نہیں۔ لیکن دوسرے کسی کا برا سوچنا بھی اتنا ہی برا ہے جتنا برائی کرنا۔ اس لیے تم اپنے ذہن میں ایسے منصوبے مت بنایا کرو۔

امی نے اسے چادر اُوڑھا کر بستر میں آرام کرنے کے لیے لٹایا اور بولیں! لیکن مالکِ کائنات کی اعلیٰ صفات دیکھو، وہ کتنا مہربان ہے، اس نے انسان کے لیے کتنی سہولت رکھی ہے۔ نیکی کرنے کا اگر تم سوچو گے، صرف منصوبہ بناؤ گے، بھلے ابھی نیک کام کیا نہ ہو تو وہ فوراً نیکی کے زمرے میں درج ہو جائے گا اور کراماً کاتبین فوراً دیکھ لیں گے کہ اللہ کے بندے نے نیک کام کی نیت کی ہے۔ "واقعی؟ امی یہ تو سچ میں بہت بڑی بات ہے۔ اماں ویسے آپ ہیں بڑی چالاک۔ آپ کو یاد ہے نا۔۔

امی کمرے میں پردے گرا رہی تھیں اور رضی بولے جا رہا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں کلاس اول میں ہوتا تھا تو آپ کہا کرتی تھیں اگر وہ کھانا جو میں نے لنچ باکس میں دیا ہے تم اسے کھانے کے بجائے کچرے کی ٹوکری میں پھینک آؤ گے تو میں نے جو کیمرے اپنی آنکھوں میں لگا رکھے ہیں وہ دیکھ لیں گے کہ تم نے لنچ خود کھایا ہے یا پھینک دیا ہے۔ میری آنکھوں کو خبر لگ ہو جائے گی، ماما آپ کو معلوم ہے میں کوئی بھی غلط کام کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا کرتا کہ امی کا کیمرہ کدھر ہے، کیمرے کی آنکھ مجھے دیکھ رہی ہے۔ رضی ہنس رہا تھا۔ "مجھے پتہ ہے آپ کی آنکھیں مجھے نہیں دیکھتی تھیں لیکن آپ کو سب علم ہو جاتا تھا۔ آپ ایسا مجھے بچہ سمجھ کر کہا کرتی تھیں نا؟"

رضی کی امی نے ہنس کر کہا "میری جان تو ابھی بھی بچہ ہی ہے، میرا چھوٹا سا بچہ"۔

رضی کی امی نے لائٹ آف کر دی تا کہ رضی ایک گھنٹہ سو جائے ور اس کے الجھے ذہن کو سکون مل جائے۔ اٹھ کر رضی نے ہوم ورک کرنا تھا اور پھر فٹ بال کھیلنے جانا تھا۔ امی کے کمرے سے نکلتے ہی رضی کی کمنٹری شروع ہوگئی اور ذہن میں پھر سے طرح طرح کے سوالات جنم لینے لگے کہ وہ قلم وہ تختی جسے لوح کہا جاتا ہے۔ کیسی ہوگی؟ کتنی بڑی ہو گی پورے آسمان جتنی۔۔

نیند دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں میں بھری تو دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنے دونوں کندھے تھپتھپائے اور بائیں کندھے پر آنکھیں موندے موندے ہاتھ رکھ کر بولا، میرا برائی والا رجسٹر تو خالی ہی رہے گا، ان شاءاللہ!

تو پیارے بچو کیسی لگی آپ کو آج کی کہانی؟ اس کہانی کا مطلب یہی ہوا کہ ہمیں نیک کام کرنے چاہئیں اور بری باتوں کے بارے میں سوچنے سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔

☆☆☆☆☆

رخشندہ نوید پر مختصر آرا

......خورشید رضوی

گزشتہ چند برس میں ابھرنے والی شاعرات میں رخشندہ نوید کا نام تیزی سے اعتبار کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے اولین مجموعے ''پھر وصال کیسے ہو'' نے جو توقعات قائم کر دی تھیں یہ دوسرا مجموعہ ان کو کامیابی سے نبھاتا نظر آتا ہے۔ رخشندہ نوید کی شاعری میں ایک توانا تخلیقی رَو کارفرما دکھائی دیتی ہے، وہ روایت سے آگے کے صحرا میں قدم دھرنا چاہتی ہے، اور او جھل کے بارے میں مثبت امکان پر نظر رکھتی ہے۔

یہ ممکن ہے گرداب سے بچ گیا ہو
سفینہ مسلسل ابھی بہہ رہا ہو

....

اس کے کلام میں ''آنچوں سے ہلتا ہوا رشوق'' اور ''جسم کی شاخ پر کھلتا ہوا زخم'' جیسے استعارے اس کے احساس کی صداقت کو ایک ایسی تازہ برجستگی سے ادا کرتے ہیں جو رخشندہ نوید کے رخشندہ ادبی مستقبل کی نوید ہے۔

☆☆☆

......بانو قدسیہ

رخشندہ جب دیکھتی ہے تو نم آنکھوں سے منظر دھندلا لیتی ہے۔ اس کا ہر قدم جو آگے بڑھتا ہے پچھلی پالوٹ جانے کا عزم ہوتا ہے۔ کسی کے ماتھے پر ایک بل دیکھ کر وہ جاں سے گزر جاتی ہے، رستہ تکنے کے لیے اسے بیکار مدتوں کا انتظار ملتا ہے، وہ زندگی کو سانس سانس یوں گزارتی ہے گویا کنوانے سر دار کھڑی ہے، ایسی رخشندہ گھر بار کیا سنبھالے جس کے اپنے در و دیوار جالوں سے بنے ہوں۔
رخشندہ کا تعلق آزادیِ نسواں کی کسی تحریک سے نہیں ہے یہ وہ لوگ ہیں جو بازی کھیلے بغیر مسکراتے ہوئے ہار جاتے ہیں، وہ کسی من بھائے کے حضور سر جھکا کر سوچتی ہے کہ انکشافِ ذات کے طوفان سے ٹکراؤں یا کسی خواب گھروندے کی خاطرات کا نذرانہ پیش کروں۔

آج کی شاعرات میں رخشندہ کا نام بہت درخشاں ہے کہ وہ دوراہے کی شاعر ہے، کبھی ایک رستے پر کبھی دوسری پگڈنڈی پر، آج کے عبوری دور میں وہ بھی فیصلہ نہیں کر پائی کہ اُسے آزادی درکار ہے کہ عافیت بری جنت__ اسی کشمکش نے اس کے شعروں میں سانسوں کی مانند زیر و بم پیدا کر دیا ہے، جس قدر وہ زندہ رہنے کی خواہش میں جیتی ہے اُتنی ہی فنا کی قینچی سے اس سانس کے تار کو کاٹتی بھی رہتی ہے۔
شاید اس کی اماں کہیں تیرا کیا بنے گا رخشندہ نوید! میں تو اسے صرف مبارکباد دے سکتی ہوں۔
جینے اور لکھنے کا یہ سلیقہ کچھ اتنا عام نہیں۔

☆☆☆

افتخار عارف......

رخشندہ نوید اردو اور پنجابی کی بہت اہم شاعرہ ہیں۔ دونوں زبانوں میں کمال شعر کہتی ہیں۔ شاعرِ بے مثال منیر نیازی کی روایتِ شعر میں اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے اپنے ہنر کا جادو جگاتی ہیں۔ دھرتی سے جڑے ہوئے موضوع، لوک انگ میں گندھا ہوا بیان اور دل سے مکمل وفاداری وہ عناصرِ شعر ہیں جن سے رخشندہ کا جہانِ معنی ظہور پاتا ہے۔
پہلے مجموعے سے لے کر پیشِ نظر کتاب تک بتدریج ارتقا پر بہت داد۔ دل کو چھو لینے والی خالص نظمیں اور غزلیں ہماری پرشور و پراگندہ زندگی میں بہت سہارا دیتی ہیں۔ یہ بڑی بات ہے۔ رخشندہ کی شاعری کسی فیشن کے تحت نہیں لکھی گئی، نہ کسی اور شاعرہ یا شاعر کی نقل میں وجود آئی ہے۔ اس کی شاعری کے سارے موسم سارے رنگ اس کے اپنے وجود کا کرشمہ ہیں۔ اداسی اور ملال کی ایک لہر ہے جو اپنے قاری کو تادیر گرفت میں لیے رکھتی ہے۔ کھت کو نرم اور میٹھے مدھر شبدوں سے سجاتی ہے۔ لوک لحن لہجے کو ایسا اعتبار بخشتا ہے جو پختہ کارِ رعنائی سے کہیں آگے کی منزل ہے۔

☆☆☆

شعیب بن عزیز......

برسوں پہلے رخشندہ نوید کا ایک شعر سن کر مبہوت رہ گیا۔ اس شعر میں رخشندہ نے کسی کی خامشی کو سننے کا دعویٰ کرتے ہوئے اس کے اظہارِ محبت سے تعبیر کیا تھا۔ شعر دیکھیے:

میں اس کی خامشی کو سن رہی تھی
وہ اظہارِ محبت کر رہا تھا

....

آج اتنی مدت بعد مجھے رخشندہ کے نئے مجموعے کو دیکھ کر ایک اور طرح کی حیرت اور مسرت کا سامنا ہے۔ ان برسوں کے دوران شائع ہونے والی شاعری کی عام روش کے برعکس اس مجموعے میں لاتعداد ایسے اشعار اور نظمیں نظر آئی ہیں جنھیں بآسانی اچھی شاعری یا بڑی شاعری یا پھر بیک وقت اچھی اور بڑی شاعری کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ میں شاعری کو شاعروں اور شاعرات کے خانوں میں تقسیم کرنے کا قائل نہیں لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں ایک حد تک مغرب میں بھی عورت کو جن مسائل اور رویوں کا سامنا ہے ان کا مکمل ادراک اور ان کے بطن سے جنم لینے والے محسوسات سے آشنائی مرد کی دنیا سے باہر کے معاملات ہیں۔ رخشندہ کی شاعری ان مسائل اور رویوں کے حوالے سے تخلیقی اظہار کی جس اعلیٰ سطح کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس نے رخشندہ کو اپنے ہم عصر شاعر اور شاعرات میں ایک علیحدہ شناخت فراہم کر دی ہے۔ میں نے ان برسوں میں رخشندہ کی شاعری میں ایک مخصوص جمالیاتی شعور کے ساتھ ساتھ جن عناصر کو تسلسل کے ساتھ کارفرما دیکھا ہے انھیں آسان اور عام فہم لفظوں میں سچائی اور تہذیب کا ملاپ کہا

جاسکتا ہے۔ کچھ عرصہ سے رخشندہ نوید کی شاعری کے ان کلیدی عناصر کے ساتھ ایک چوتھے عنصر کا اضافہ ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ رخشندہ کی شاعری کی یہ چوتھی بُعد اس منفرد اور بے نام جرأت سے عبارت ہے جو اس دوران اس کی شاعری میں چھلکنے در آئی ہے۔ تاہم میرے اور میری طرح رخشندہ کے بہت سے مداحین کے لیے یہ امر باعث اطمینان ہے کہ رخشندہ کی شاعری میں نظر آنے والی یہ جرأت ایک ایسی عورت اور اکثر صورتوں میں ایک ایسے فرد کی جرأت ہے جو منفی اور منافقانہ سماجی رویوں کے خلاف جنگ میں ایک حقیقی فریق کا کردار ادا کر رہا ہے اور جس پر اس کے کڑے سے کڑے ناقد کو بھی مستعار جذبوں یا روشِ عام کی تہمت لگانے سے پہلے سو بار سوچنا پڑے گا۔

☆☆☆

معین نظامی......

رخشندہ نوید بہت پڑھی لکھی، قابلِ توجہ اور اہم شاعرہ ہیں۔ وہ بہ یک وقت کئی زبانوں میں یکساں قدرت سے شعر کہنے کی خداداد استعداد رکھتی ہیں۔ ان کا شعر پڑھنے کا انداز بھی بہت مختلف اور متاثر کن ہوتا ہے۔ وہ بہت عمدہ نثر نگار بھی ہیں۔ عملی زندگی میں بھی وہ قابلِ رشک حد تک کامیاب، فعال اور متحرک ہیں۔

رخشندہ نے روایتی اصنافِ سخن میں بھی کامیابی سے لکھا ہے اور کلاسیکی موضوعات بھی نئے رنگ میں عمدگی سے برتے ہیں۔ مگر ان کی شناخت وہ پیچ در پیچ اور تہ در تہ موضوعات و مسائل ہیں جو ایک ذہین، حساس اور محبت کرنے والے جدید ذہن کو پیش آتے ہیں اور جن کے کئی احساساتی پہلو اور کئی نفسیاتی زاویے کسی نادریافت جزیرے کی طرح ہمارے لیے نا منکشف ہیں۔ یہ جذبات اور افکار اپنے ابلاغ اور اظہار کے لیے نئے اصنافی پیکر پسند کرتے ہیں اور نئے پیرایوں ہی میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

جدید ذہن کے مقدر میں زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی ایک تنہائی اور اداسی ہے۔ نئے زمانوں اور سہولیات یافتہ معاشروں کا فرد آسائشوں کے نوکیلے اور زہریلے کانٹوں سے بنا بھاری تاج پہنے اور مسکراتے رہنے پر مجبور ہے۔ لاتعلقی کی اس حیرت ناک نگری میں سب کچھ ہر پل تغیر پذیر رہتا ہے، چیزیں بھی، جذبے بھی، لوگ بھی۔ رخشندہ کے دل اور دماغ کی آپ بیتی بھی یہی کچھ ہے جس کے مختلف منظر وہ پوری سچائی سے اپنی خوب صورت شاعری میں ہمیں دکھاتی رہتی ہیں۔

نسائیت اور نسائی لب ولہجہ رخشندہ کی بنیادی ترجیح اور پہچان نہیں ہے۔ وہ کسی فیشن کے زیر اثر یا تکلف اور اہتمام سے اس نوعیت کے شعر نہیں کہتیں، یہ سب تو ان کے خمیر کا جزوِ اعظم اور ان کے خیالوں خوابوں کا منطقہ ہے۔ تخلیق کار کی حیثیت میں وہ تذکیر و تانیث کے سانچوں سے بالاتر ایک ملکوتی فضا میں ہوتی ہیں جہاں اولادِ آدم کی پہچان صرف انسان اور اس کے اندرون کی شناخت صرف انسانیت کے نام سے ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

رخشندہ نوید / ایک ادبی نوید

خواتین و حضرات "لاہور کی ہر ادبی تقریب میں رخشندہ نوید، نیلم احمد بشیر، بلقیس ریاض، سیما پیروز، سلمیٰ اعوان اور محترمہ فرحت پروین کی آمد کو لازمی سمجھا جاتا ہے، سو، جس تقریب میں یہ ادبی ٹولی موجود ہو، اس تقریب کو کامیاب ہی نہیں بابرکت بھی تصور کیا جاتا ہے۔ میں اُس ٹولی میں موجود خواتین کو سینئر جونیئر اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ خود میری عمر بھی بہت کم ہے وہ تو میں ذرا بیمار شمار رہتا ہوں اس لیے 67 سال کا لگتا ہوں، ظاہر ہے اس 67 سالہ خورد برد نوجوان نے تقریباً 42 سال کا ادبی سفر ضرور کیا ہے وہ ادبی ٹرین جس کے ڈبے میں رخشندہ نوید بیٹھی تھیں، میں اس ڈبے میں بیٹھا نہیں مگر چائے گرم چائے چائے گرم کہتا ہوا گزرا ضرور ہوں اور گزرتے گزرتے یقیناً شعر بھی سنے اور گفتگو بھی، گھر پر بیٹھتے مسکراتے اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع کرتی ہوئی رخشندہ سے بھی ملا اور اداس گھبرائی ہوئی نوکری تلاش کرتی ہوئی رخشندہ سے بھی۔ ٹیلی وژن پر کمپیئر بن کر بیٹھنے والی رخشندہ نوید سے بھی ملاقات ہوئی اور کئی مجموعوں کی تخلیق کار رخشندہ نوید سے بھی مکالمہ ہوا، مگر کبھی بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ یہ مجھے کچھ ڈکٹیٹ کروا رہی ہیں یا یہ سمجھ رہی ہیں کہ میں ایک خاتون ہوں، مجھے ہر شعر پر رعایتی نمبر دیں خاص احترام دیں اور پاس کر دیں، یا مجھے ادا جعفری اور پروین شاکر سمجھیں۔ ویسے یہ آج جیسی نظر آتی ہیں اپنے پہلے مجموعے کے وقت بھی یہ ایسی ہی تھیں بلکہ اس سے بھی پہلے رخشندہ نوید کی ذاتی ادبی بیٹھک میں زیادہ تر افسانہ نگار خواتین کا قبضہ ہے۔

اعجاز رضوی

سلمیٰ اعوان ناول نگار، بہترین افسانہ نگار، فرحت پروین بہترین افسانہ نگار، مترجم، اور نظم نگار، بلقیس ریاض سفرنامہ نگار، سیما پیروز افسانہ نگار، نیلم احمد بشیر خوبصورت افسانہ نگار، سو رخشندہ نوید شاعری میں جیت گئی اور نمبر ون ہو گئی، مگر اس نے ٹولی بدلی نہ ٹولی سے باہر کبھی یہ کہا کہ بس مجھے ہی شاعرہ سمجھو اگرچہ رخشندہ نوید کے پہلے تمام مجموعے بھی جناب احمد ندیم قاسمی، جناب احمد فراز، جناب شہزاد احمد، جناب خالد احمد، جیسے شعرا سے داد حاصل کر چکے ہیں اور اب اس مجموعے پر ڈاکٹر خورشید رضوی کی گواہی نے ثابت کر دیا ہے کہ رخشندہ نوید ایک مکمل شاعرہ ہیں۔ اب سے پہلے پھر وصال کیسے ہو اور خامشی کو سن رہی ہوں پر میں رائے بھی دے چکا اور مضمون بھی لکھ چکا، آج کی تقریب میں مشہور و معروف نقاد موجود ہیں اس لیے میں بس رخشندہ نوید کی سی وی شیئر کروں گا۔ باقی سی وی کی تفصیل اور شاعری کی جزیات پر ڈاکٹر ایڈوائس بعد میں لی جائے گی، اور بات آگے ہی نہیں آگے سے آگے بڑھے گی۔ رخشندہ نوید کے تازہ مجموعہ کلام "رات مجھے اچھی لگتی ہے" خاص غزلیات کا مجموعہ ہے، حالانکہ رخشندہ نوید نظم بھی بھرپور کہتی ہیں پچھلے مجموعے خامشی کو سن رہی تھی...... میں بہت سی نظمیں تھی اور خاص طور پر ہیٹ لسٹ...... ابہام۔ فیس بک ذرا سا گھر بڑا لے لو نے مجھے کافی دیر روکے رکھا تھا، اور میں رخشندہ کی نظموں کا باقاعدہ انتظار کرنے لگا۔ اور آخر کار وہی ہوا اچھی بھلی نظم نگار مشاعرے کی مجبوری سے غزلوں تک محدود ہو گئی، خیر مشاعرے کے دم پر ہی شاعری چلتی رہے یہ بھی خوبی کی بات ہے، شاعری کے علاوہ رخشندہ نوید بہترین خاکہ نگار ہیں اور روداد نگاری میں بھی ان کا جواب نہیں۔ یہ جس خوبصورتی اور جذبات کے ساتھ خاکہ لکھتی ہیں تو لگتا ہے ان کا کوئی ثانی نہیں میں نے لگتا ہے اس لیے کہا کہ کوئی پتہ نہیں ان کی بغل سے کوئی ثانی نکل کر کہہ دے، لو میں ہوں ثانی۔

رخشندہ نوید سے احمد ندیم قاسمی صاحب کے آفس میں ملاقات رہی اس برکتی آفس میں سلمیٰ اعوان، نیلم احمد بشیر، فرحت پروین، بلقیس ریاض، بشریٰ رحمٰن، سیما پیروز سے بھی ملا۔ اس آفس میں سب کے آنے کا انداز جدا تھا، مثال کے طور پر وہاں سلمیٰ اعوان کی آمد ہوتی تو وہ دروازہ کھولتے ہی کہتی:

"اجازہ مرے بچے اج بڑی گرمی اے"

نیلم احمد بشیر آتی تو کہتی۔ ہائے لاہور کا تو بیڑا غرق ہو گیا۔ بہت رش ہوتا ہے وعلیکم السلام، وعلیکم السلام

بلقیس ریاض کہتی، ہائے ریاض آج اکیلے ہیں پھر بھی آ گئی، سیما پیروز کہتی دیکھنا اعجاز پیروز باہر کھڑے ہیں انھیں تو دیکھنا جبکہ رخشندہ کا فقرہ ہوتا۔ اور اعجاز کیا حال ہے۔ اب میں کیا کیا یاد کروں۔ سلمیٰ اعوان کی گرمی / سردی، نیلم کی جلدی جلدی، سیما پیروز کی دیکھا بھالی، بلقیس ریاض کی کلم کلی یا رخشندہ نوید کا اور اعجاز کیا حال ہے۔

خوب صورت کڑھائی والا سوٹ، ٹک ٹک کرتی ہوئی ہل، پھر کسی میڈم کی طرح ہیلو، ہائے کے اشارے کرتی ہوئی رخشندہ نوید، کا سراپا، ہجر کی ماری شاعرہ سے زیادہ فوڈ اتھارٹی کی ڈی جی سے ملتا جلتا ہے اور دیکھو تو یقین ہی نہیں آتا کہ یہ شاعری بھی کرتی ہیں اور کہتی ہیں:

اے ملاقاتی، دیکھ تیرے لیے
پورا اک دن بچا کے رکھا ہے

کمرہ ہوتا ہے دل کے اندر بھی
ہم نے کیا کیا چھپا کے رکھا ہے

ہر گھڑی موت کا ڈر نہیں چاہیے
زندگی جا یہ ترتر نہیں چاہیے

رقصِ بسمل کو محدود کیسے کروں
تنگ و تاریک سا گھر نہیں چاہیے

رخشندہ نوید کی ساری کتاب ہی خوبصورت ہے ٹائٹل کے اندر والی جدت نے بہت خوش کیا، پھر شاعری نے بھی، بس ایک جگہ یوں لگا جیسے رخشندہ نوید مجھے پسند نہیں کرتیں۔ وہ کہتی ہیں:

میرے خیال میں گم بے حساب پیتے ہوئے
تم اچھے لگتے ہو مجھکو شراب پیتے ہوئے

اب میں اُن کو اچھا لگوں۔ اس چکر میں دو تین بار بوتل کے پیسے اکٹھے کیے مگر پھر سیون اپ پی کر گھر آ گیا اب سوچ رہا ہوں کاش میرا بھی کوئی گریڈ بیس کا افسر دوست ہوتا، تو کم سے کم بغیر پیسے خرچ ہوئے میرا یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا، مگر جناب قسمت میں ایسے حالات ہیں، نہ واقعات، سو، سلمیٰ اعوان کے مطابق، بس چل رہے ہیں، اور کہہ رہے ہیں کہ اعجاز

مرے بچے اج بڑی گرمی اے
فنکشن رخشندہ نوید دا اے اس لیے تو آجا

سو میڈم رخشندہ نوید لیں میں آ گیا اور بوتل بھی ساتھ ہے مگر بوتل ہے خوشیوں کی جو بالکل آپ کی شاعری کی طرح لگتی ہے۔

اپ اپ اپ اینڈ۔ جسٹ پرفیکٹ

☆☆☆☆☆

گڑیا کی گڑیا

کھلے بازار میں سورج کا درہم
خرچ ہوتے ہی
قدم گھر کی طرف اُٹھنے لگے تھے
اور مری جھولی ضرورت کی ہر اک شے سے لدی تھی
کوئی شے ارزاں، کم قیمت نہیں تھی
تھکن پاؤں سے اتری
شوق کے بجھتے الاؤ نے دھواں تانا
ہتھیلی کی لکیروں میں نمی کے
رنگ پھرتے تھے
میں اپنے آپ سے الجھی
تو میں نے اس قدر جانا
کہ میرے ہاتھ کوئی چیز
بڑھیا بھی نہیں آئی
اُٹھایا سَر تو
چھلنی ہوگئی اس کی نظر کے ننھے تیروں سے
کہ پھر اس بار میری ننھی سی گڑیا کی گڑیا
بھی نہیں آئی!

چاول کا اِک دانہ

اپنی چاپ سے ڈرتی آنکھیں
پنکھ سمیٹے
چپکے چپکے پوچھ رہی تھیں
آ جاؤں میں گھر کے اندر
آنگن میں میلے برتن سے
اِک انمول خزانہ لینے
میں نے سانسیں روکے رکھیں
ننھی چڑیا در تک آئی
چاول کا اِک دانہ لینے

رخشندہ نوید

رات کی رات

شام اُتری
بدن پر حسین لمس کے پھول کھلنے لگے
قرب کی لَو سرہانے جلی
خواب گاہوں کے پیچھے
ہواؤں کے پُرنم خوابوں کی آہٹ سے
ملنے لگے
شام اُتری بدن پر حسین لمس کے پھول کھلنے لگے
دھیرے دھیرے رواں
کاروانِ فلک پر ستاروں کے جھرمٹ میں
ڈوبی ہوئی رات جانے لگی
چاہتوں کی ہوا سرسرانے لگی
بند کمروں میں
کھڑکی کے پردے اُٹھے
ساعتِ صبح نے ادھ کھلی چشم کو
خواب سے جاگنے کا اشارہ دیا
صبح کی بارگاہوں میں ننھی کرن
روشنی پھڑ پھڑانے لگی
رات جانے لگی
گرم پانی کے ٹب میں
محبت کی ابرق بہائی گئی
"آملیٹ اور بریڈ
چائے دانی میں پانی اُبلنے لگا"
"میری ٹائی کہاں ہے"
"اٹھاؤ یہ جوتے انہیں کر کے پالش مرے پاس لاؤ"
"یہ صورت مرے سامنے سے ہٹاؤ"
اور
چاہت بھری نرم ٹھنڈی ہوا
دل کی دہلیز پر
سر جھکائے کھڑی
سوچتی رہ گئی
"پیار کی کس قدر مختصر بات تھی
یہ پسندیدگی رات کی رات تھی"

رخشندہ نوید

نو صدیوں کا کرب

کس کرب سے آنکھیں چار ہوئیں
یہ کیسا سفر آغاز ہوا
گھونگھٹ الٹا صحرا کی گرم ہواؤں نے
اندھیاروں نے لب ثبت کیے پیشانی پر
اور دشت کی دہکی مٹی نے
تری مانگ کے اجلے رستوں میں سیندور بھرا
طوفان کی دستک نے کھولے
در ترے عروسی کمرے کے
اک آگ اٹھی، اک آگ بجھی
اک آگ بجھی
غالیچوں کے سب غنچوں میں
گل چہرہ نوک خار نے آخر چوم چوم کر چاٹ لیا
ترے مجلا تن کی مہک چرا کر جنگل میں چھپ گئی ہوا
انگار بدن پر زیور زیور جڑے رہے
آزار ترے بستر کی شکن میں پڑے رہے
تری برف آنکھوں کے کاجل کی
ان سرد سیاہ لکیروں سے
ادھ جلی ہوئی شمعوں کا دھواں
پلکوں سے رواں

دیوار سے لے کر درزوں تک
ہر آہٹ اک پیغام ملا
کوئی پھول کھلا؟ کوئی پھول کھلا؟
اِس گلشنِ دل کی ڈالی پر
اک آتشِ گل کی آمد تک
شعلوں سے ہم آغوش رہو
خاموش رہو
لوہا کاٹو، مٹی چاٹو
ترے پلتے درد کے سائے کو
صدیوں پہ محیط ٹھہرنا ہے
تخلیق کا درد مسلسل ہے
اسے نو صدیوں تک سہنا ہے

رخشندہ نوید

کسی اور سے محبت

تُو کسی اور سے محبت کر
میرے حیرت کدے میں پاؤں نہ رکھ
دل کے آئینۂ خیال کی لَو آنکھ کو خیرہ کر بھی سکتی ہے
جو محبت تمھاری جان کی ضو
وقت کے ساتھ مر بھی سکتی ہے
تُو کسی اور سے محبت کر!
میرے حیرت کدہ سے باہر ہو
اس کے دیوار و در پہ کندہ ہیں ایسے نقش و نگار
جذبوں کے
جو تری فہم سے گریزاں ہیں
میری چاہت کے تُند دھارے میں
خواب اور جستجو کی بستی تک، گہرے دریا
سے میری ہستی تک
ناؤ کاغذ کی ساتھ لائے گا
من کے ساگر کی اُجلی موجوں میں تو
اُترتے ہی ڈوب جائے گا
تُو وہی زلف کا اسیرِ کہن!
ساحلوں پر تلاش کرتا ہے
نیلگوں پانیوں کی جل پریاں
یونہی اس راہگزر پہ چلتے ہوئے
میرے ساحل پہ آن ٹھہرا ہے
چار دن کی بہار کے پنچھی بحرِ الفت بہت ہی گہرا ہے
تُو کسی اور سے محبت کر!
میری آنکھوں میں آرزو کا صدف
اک یقیں کی تلاش میں گُم ہے
ذات میری انہیں جزیروں پر اس
کنارے کی راہ تکتی ہے...

تمنا کا چکور

دُکھ کا اِک احساس ہے یہ دُکھ نہیں
ذائقوں کا پھیکا پن اور بے قراری کی چبھن
منتظر آنکھوں میں جم کر رہ گیا رنگِ الم!
بے بہاری موسموں میں کھلنے والے
پیلے نیلے، اودھے پھولوں سے
تری خوشبو کے اُڑ جانے کا غم!
دل میں پیدا ہونے والے، وسوسے، خدشات
دھڑکے، خوف کا بے نام شور
اِک تمنا کا چکور
جو کسی مہتاب کی جانب سفر کرتا نہیں
اِس سے پہلے کچھ نہیں
بعدِ سفر بھی کچھ نہیں!
دُکھ کا اِک احساس ہے یہ دُکھ نہیں
اب مرے دِل پر کسی غم کا اثر بھی کچھ نہیں

رخشندہ نوید

کشفِ ذات

نہ جانے ہر کوئی مجھ سے یہ پوچھتا کیوں ہے
کہ شاعری کے سوا اور مشغلہ کیا ہے
یہی سوال ہر اک شخص کرتا رہتا ہے
کہ روز و شب کے گزرنے کا سلسلہ کیا ہے

میں پوری اُتروں کسی کی نگاہ میں کیسے؟
مرا ہی آئینہ خود جھوٹ منہ پہ بولے گا
یہ ذات بھی تو کبھی منعکس نہیں ہوتی
تماشا گاہ میں کب دِل بھی زخم کھولے گا
میں ڈھونڈ ڈھونڈ کے لاؤں وجود کے ٹکڑے
مگر زمانہ مری نبض کیا ٹٹولے گا

سو ساعتوں کے اُلجھتے ہوئے سوالوں سے
کمال اتنا ہے دامن بچائے پھرتی ہوں
میں شاعری کے سوا اور کچھ نہیں کرتی
میں اپنے کاندھوں پہ خود کو اُٹھائے پھرتی ہوں

نوحے کم تھے

اماں تُو دفن کر دیا تھا کہ نوحے کم تھے
ابھی علم رنگ آنچلوں کی کمی تھی، ماتم کناں سروں پر
اماں تُو دفن کر دیا تھا کہ آنسوؤں کی رواں دواں
نہر بند توڑے
طویل صف میں جلوسِ احباب دوستاں سے
لپٹ کے پلّو کوئی نچوڑے!
وہ گہرا دکھ
جس کی یاد کا اک مزار تعمیر ہوگا دل پر
اماں تُو دفن کر دیا تھا
کسی گھڑی اہتمامِ محفل میں اپنا یہ ڈھنگ سرے سے
کسی نئی ماتمی فضا میں، دوبارہ پھر دفن کرنا ہوگا
ابھی تلک غم کی روح بے چین پھر رہی ہے
کچھ اتنے برسوں نے مل کے آنسو جمع کیے ہیں
ہوا نے چُن چُن کے نوحے پلّو میں پھر سے باندھے ہیں
پھر دوبارہ سے سینۂ درد چاک ہوگا
اور عشق کی قبر پھر بنے گی
اماں تُو دفن کر دیا تھا کہ نوحے کم تھے!

رخشندہ نوید

غزلیں

درودیوار سے جالا نہیں جاتا ، اماں
مجھ سے گھر بار سنبھالا نہیں جاتا ، اماں

فکرِ عقبیٰ ہو کہ دُنیا ہو کہ ہو فکرِ فراق
روگ کیسا بھی ہو پالا نہیں جاتا ، اماں

یہ جو کچھ اشک مری آنکھوں میں در آئے ہیں
ان کو الفاظ میں ڈھالا نہیں جاتا ، اماں

پاؤں سے ہٹ کے تہہِ دل میں اُبھر آتا ہے
مندمل ہو کے بھی چھالا نہیں جاتا ، اماں

بحر درکار رہا وُسعتِ غم کو لیکن ...!
موجِ دریا کو اُچھالا نہیں جاتا ، اماں

میں جو آنسو کی طرح لوٹ کے پھر جا نہ سکی
یوں تو اپنوں کو نکالا نہیں جاتا ، اماں

کیسے نکلے گا اندھیروں سے مرے بخت کا چاند
اس کے اطراف سے ہالا نہیں جاتا ، اماں

رخشندہ نوید

اُلجھے اُلجھے ہوئے لگتے ہیں، یہ قصہ کیا ہے
آپ کچھ ہم سے چھپانے لگے، ایسا کیا ہے

ناؤ کاغذ کی اِسی سوچ میں ڈوبی دیکھی
گہرے پانی سے گزر جانے کا رستہ کیا ہے

گُل بھی اُن کے ہیں ثمر اُن کے، شجر اُن کے ہیں
وہ سبھی کے ہیں، کبھی اُن کے ہیں، میرا کیا ہے

دیکھنے میں تو بہت عام ہے اوروں کی طرح
تری بینائی نے اس شخص میں دیکھا کیا ہے

کرچیاں بکھری، نہ آواز ہوئی رخشندہ
کون پوچھے مرے پہلو میں یہ ٹوٹا کیا ہے

غزلیں

کوئی ساحل سحر آثار ہو گا
اِسی خواہش پہ دریا پار ہو گا

فقط یہ سوچ کر چلتی رہی ہوں
کہیں تو سایہ اشجار ہو گا

اگر یہ وہم ہے تو بُھربُھرا ہے
اگر یہ بُت ہے تو مسمار ہو گا

ہماری جان کب نکلے گی آخر...!
تو کیا اب آخری اِک وار ہو گا

کہاں تک راستے اُلجھے رہیں گے
عدو کب تک پسِ دیوار ہو گا

پرندہ بھول کر نکلا وطن سے
صدا دینا اسے بیکار ہو گا

ذرا سی دور ہی منزل کھڑی ہے
ذرا سا حوصلہ درکار ہو گا

ابھی رخشندہ گہری نیند مت سو
ابھی یہ آئینہ بیدار ہو گا

رخشندہ نوید

عین ممکن ہے اُسے کچھ یاد آئے دیکھ کر
وہ بھری محفل میں ہم کو مسکرائے، دیکھ کر

کھل اُٹھی رنگت جو دیکھا رُوبرُو چہرہ وہی
دِل پہ قابو ہم بھی اپنے رکھ نہ پائے، دیکھ کر

ترکِ الفت پر تو ہم قائم تھے لیکن کیا کریں
ان کی خواہش دِل میں اب بھی سر اُٹھائے، دیکھ کر

ہم بزعمِ خود نجانے سوچ کر آئے تھے کیا
وہ پگھل کر موم ہو، وہ مان جائے، دیکھ کر

جانے کِس دُشمن کا ہے یہ مشورہ کہ بزم میں
غیر کی جانب ہمارا دِل دُکھائے، دیکھ کر

دِل ہمارا دھڑکا رخشندہ اچنبھا تو نہیں
شاخ پر پنچھی بھی اُن کو پھڑپھڑائے، دیکھ کر

غزلیں

کہانیاں نہ ختم ہوں گی اختتامیوں کے ساتھ
مجھے قبول کر مری تمام خامیوں کے ساتھ

تو اپنے حسن و ناز کے غرور میں ہی جل بجھی
وہ لوٹ لے گیا ہے بزم خوش کلامیوں کے ساتھ

کسی مقامِ جبر پر شہید ہو گئی ہوں میں
مجھے بھی دفن کیجیے گا سو سلامیوں کے ساتھ

جہاں جہاں گئی ہوں میں تمھارا ہاتھ تھام کر
ہوا اِدھر اُدھر گئی سبک خرامیوں کے ساتھ

رخشندہ نوید

شجر کو ہر گھڑی اک ڈر رہا تھا
تو کیا چڑیا کا اُس پہ گھر رہا تھا

کہاں خوشبو مرے حصے میں آئی
کہاں شانے پہ اُس کے سر رہا تھا

گلے مجھ کو لگا کر جاتے جاتے
وہ میرے دل میں آنسو بھر رہا تھا

میں اُس کی خامشی کو سُن رہی ہوں
وہ اظہارِ محبت کر رہا تھا

کوئی جھونکا جدا کر دے نہ تجھ سے
مرے ہر سانس میں یہ ڈر رہا تھا

اِنھی خوش رنگ پھولوں کے جلو میں
کسی تتلی کا ٹوٹا پَر رہا تھا

اسی باعث میں شاید جی رہی تھی
کہ میرے ساتھ سب کچھ مر رہا تھا

بظاہر کوئی خوبی تھی نہ اُس میں
مگر ہر ایک سے برتر رہا تھا

ہماری ناؤ تھی موجوں سے آگے
مگر طوفان تو آ کر رہا تھا

غزل

یہ بھید کھلا معرفتِ شام و سحر سے
دن، شب سے جدا ہے نہ الگ عیب، ہنر سے

ہر لفظ کے ہاتھوں میں تھی اک نرم سی دستک
کہنے کو تو خالی تھے مرے شعر اثر سے

اب تک تری یادیں، مری آنکھوں کی چمک ہیں
یہ نم بھی کوئی چھین نہ لے دیدۂ تر سے

اے عشق، سبھی طعن بہ لب، سنگ بہ کف ہیں
اے جاں، ترے راہی پہ کہیں پھول نہ برسے

سورج تھا، مگر، رات گئے ڈوب سکا تھا
اے صبحِ قیامت، میں نکل آؤں نہ گھر سے

ہر سمت بس اک خوف محیطِ دل و جاں تھا
کس سمت سے کس پل میں پلٹ آؤں سفر سے

سامان بہم کر، کہ نہ لوٹے کبھی خالی
یارب، کوئی مجھ بے سرو سامان کے در سے

اے بے گنہی تو مرے ہمراہ چلے گی
سر لے کے بھی الزام نہ اترے مرے سر سے

اک بے خبری مایۂ اربابِ خبر تھی
یہ بات کھلی، حیرتِ اربابِ نظر سے

خالد احمد

غزل

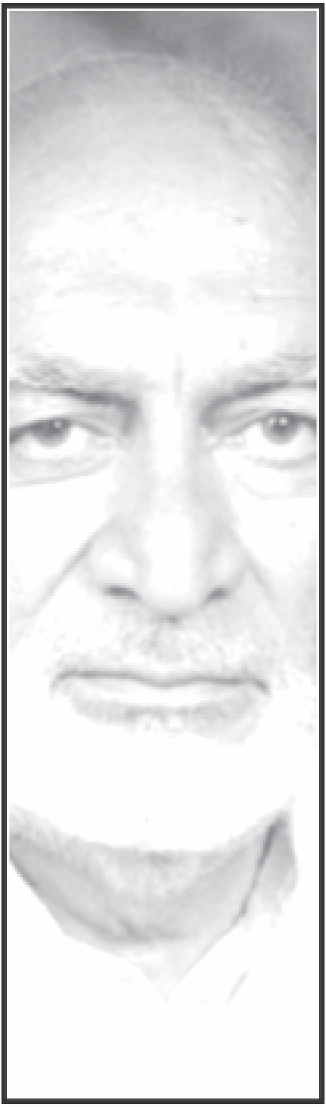

جہاں میں آپ جیسا رہ گیا ہوں
میں گویا اب اکیلا رہ گیا ہوں

لڑائی میں بہت زخمی ہوا تھا
غنیمت ہے کہ زندہ رہ گیا ہوں

مجھے ، موسم نے جب اپنا بنایا
ہوا کا ایک جھونکا رہ گیا ہوں

سُنی ہیں سب کی باتیں خامشی سے
بہر صورت میں اچھا رہ گیا ہوں

نرالا کیف و کم طاری ہوا تھا
میں اپنے غم پہ ہنستا رہ گیا ہوں

نئے مضمون اُترے ہی نہیں تھے
غزل اک کہتا کہتا رہ گیا ہوں

اُڑے تھے صبح دم سارے پرندے
میں اک ٹہنی پہ سویا رہ گیا ہوں

سنائے دوستوں نے شعر ثاقب
مگر میں ناشنیدہ رہ گیا ہوں

آصف ثاقب

غزل

یاد اُس کی جو دل مقام نہیں
صبح کیا صبح؛ شام، شام نہیں

زندگی اپنی چال چلتی ہے
کسی فرعون کی غلام نہیں

وہ ہمیں کتنا جان سکتا ہے
دو قدم کا جو ہم خرام نہیں

اب کے جلدی میں جو کیا اس نے
چلتا دِکھتا وہ انصرام نہیں

وہی تخفیف دوسروں کی کرے
جس کو خود اپنا احترام نہیں

کام ہو تو تپاک دیکھ اُس کا
ورنہ برسوں دعا سلام نہیں

اپنا مقصود ہے نئی تعمیر
یادگاروں کا انہدام نہیں

میرے مضموں انہیں کھٹکتے ہیں
حسنِ فن پر تو کچھ کلام نہیں

حرفِ اقبال تو ہے اک تحریک
صرف شعرِ جدا کا نام نہیں

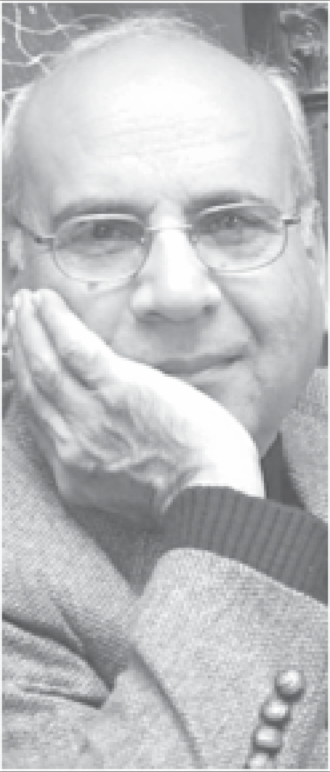

جلیل عالی

غزل

ترے خیال سے تخلیقِ رنگ و بو کر کے
ہنر تمام کیا خود کو سرخرو کر کے

ہزار تلخ سہی مجھ پہ ہجر کے موسم
گزار لیتا ہوں پھولوں سے گفتگو کر کے

کمال یہ ہے ابھی تک سنبھال رکھا ہے
اک آئینے میں ترا عکس ہو بہو کر کے

بنامِ حسن پرستی ، بنامِ عشقِ بتاں
اسی کو دیکھ لیا ہم نے چارسو کر کے

بچا بچا کے رکھی ہم نے پیاس شدت کی
نہال ہوتے ہیں قطرے کو آب و جو کر کے

اسی خیال سے خود کو ادھورا چھوڑ دیا
کرے گا کیا کوئی تکمیلِ آرزو کر کے

درست ہے کہ بجھالیں گے اپنی روح کی پیاس
مگر یہ کیا کہ بدن کو لہو لہو کر کے

لباسِ زیست وہی ہے پھٹا پرانا سا
پہن چکا ہوں جسے بار ہا رفو کر کے

ہمارے خواب کنور اتنے خوبصورت تھے
نماز بھول گئے ، سو گئے وضو کر کے

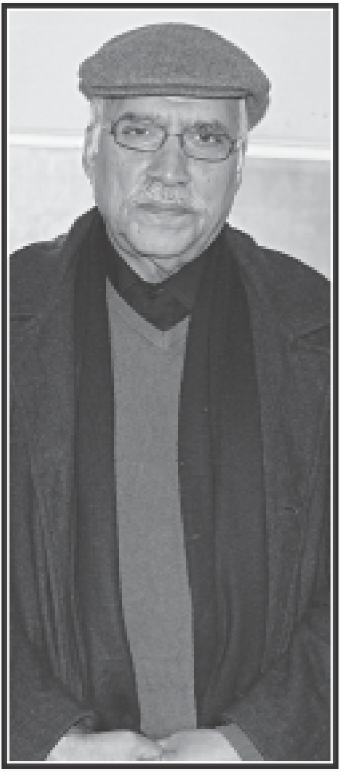

اعجاز کنور راجہ

غزل

نئے تکور سے منظر بناتا رہتا ہوں
سُخن کے زور سے منظر بناتا رہتا ہوں

مَیں دیکھتا ہوں جو مخروطی اُنگلیاں اس کی
تو پور پور سے منظر بناتا رہتا ہوں

اسی لیے تو چمکتے ہیں آسمان پہ وہ
دھنک کی ڈور سے منظر بناتا رہتا ہوں

زمانہ کرتا ہی جاتا ہے کیوں نظر انداز؟
میں جتنے غور سے منظر بناتا رہتا ہوں

میں مطمئن نہیں ہوتا ہوں ایک منظر پر
کچھ اَور، اَور سے منظر بناتا رہتا ہوں

اگرچہ چاند تو تصویر میں نہیں آتا
کئی چکور سے منظر بناتا رہتا ہوں

مری طرف وہی بے منظری رہے، چاہے
کسی بھی طور سے منظر بناتا رہتا ہوں

کبھی پروں سے کبھی اُس کے کالے پیروں سے
ہمیشہ مور سے منظر بناتا رہتا ہوں

جو مجھ میں نقش کیے ہیں مرے ستم گر نے
وہی کٹھور سے منظر بناتا رہتا ہوں

نسیم، مُجھ پہ مسلط ہیں جتنے سناٹے
انہی کے شور سے منظر بناتا رہتا ہوں

نسیم سحر

غزلیں

سینہ مرا، پر دل ہے کسی اور کا اس میں
رہتا ہے کوئی شخص گئے دور کا اِس میں

پنڈی سے محبت مری بے وجہ نہیں ہے
اِک ٹکڑا ہے اُجڑے ہُوئے بھنبھور کا اِس میں

مَیں قرطبہ جانے کو بھی تیار ہُوں لیکن
ماحول اگر سارا ہو لاہور کا اِس میں

مائل ہے طبیعت جو الم کوشی کی جانب
ہے ہاتھ تمھارے ستم و جور کا اِس میں

حالی بھی سر آنکھوں پہ مگر شیوۂ اقبال
اِک جذبہ ہے موجود عجب طور کا اس میں

خاور اعجاز

زمانے کی نگاہوں میں فقط اِک داستاں ہُوں مَیں
حقیقت میں ورائے حیطۂ وہم و گماں ہُوں مَیں

مرے چپ چاپ شہرِ خامشاں آنے پہ کیا حیرت
یہیں آ جاؤ گے اِک روز تم بھی، اَب جہاں ہُوں مَیں

مرے ہی زورِ بازو پر قبیلے کو بھروسہ ہے
اگرچہ دیکھنے میں ایک جانِ ناتواں ہُوں مَیں

مجھے کیا ڈھونڈتے پھرتے ہو رزمِ زندگانی میں
مری خودرفتگی سے پوچھ لو یارو! کہاں ہُوں مَیں

مری ہستی کے بارے میں یہی اظہار کافی ہے
مکاں میں رہ رہا ہُوں اور حدیثِ لامکاں ہُوں مَیں

یہی تو ہے ثبوتِ ارتقائے زندگی خاور
کبھی رہرو تھا لیکن آج میرِ کارواں ہُوں مَیں

غزل

شہرِ بلقیس کے مہمان ہوا کرتے تھے
ہم بھی قسمت کے سلیمانؑ ہوا کرتے تھے

آدمی ایک طرف، اڑتے ہوئے طائر بھی
لحنِ داؤدؑ پہ قربان ہوا کرتے تھے

دیکھتے تھے کسی کشتی سے کسی پیارے کو
سامنے نوحؑ کے طوفان ہوا کرتے تھے

قید میں گریۂ یعقوبؑ کی خبریں پہنچیں
سن کے یوسفؑ بھی پریشان ہوا کرتے تھے

تھا زلیخا کو بہت پیار مہِ کنعاں سے
دیکھنے والے بھی حیران ہوا کرتے تھے

تختِ تعبیر میسر تھا کہ اُس دور میں ہم
خطۂ خواب کے سلطان ہوا کرتے تھے

آج ہیں قصۂ پارینہ مگر ہم گلزار
ایک روداد کا عنوان ہوا کرتے تھے

گلزار بخاری

غزل

نظروں سے گرا دو گے زیادہ سے زیادہ
کیا اور صلہ دو گے زیادہ سے زیادہ

دیوار بنانے سے تو رستے نہیں رکتے
دیوار بنا دو گے زیادہ سے زیادہ

میں پھر بھی چلا آؤں گا دیدار کی خاطر
محفل سے اٹھا دو گے زیادہ سے زیادہ

ساغر کو تو ہم ہاتھ لگاتے نہیں باقی
آنکھوں سے پلا دو گے زیادہ سے زیادہ

بے سمت سرابوں کا سفر ختم نہ ہوگا
بس خاک اُڑا دو گے زیادہ سے زیادہ

یادوں کی دبی راکھ نہ ہر شام کریدو
شعلوں کو ہوا دو گے زیادہ سے زیادہ

دیوانہ بنانے کا ہنر آتا ہے تم کو
دیوانہ بنا دو گے زیادہ سے زیادہ

ہر پیڑ سنائے گا تمہیں میری کہانی
اک نقش مٹا دو گے زیادہ سے زیادہ

ہم جلنے کو تیار ہیں پردہ تو ہٹاؤ
بجلی ہی گرا دو گے زیادہ سے زیادہ

باقی احمد پوری

غزل

اس لیے بوجھ نہ کاندھے سے اتارا اس کا
ٹوٹ کر گر نہ پڑے عرش منارہ اس کا

پیرہن سے بھی لپکتی ہیں شعاعیں جس کی
اس زمیں کا نہیں لگتا مجھے گارا اس کا

دست گیری تو وہ کرتا ہے دکھاوے کے لیے
اُٹھ نہیں سکتا کوئی لے کے سہارا اس کا

کیوں ہے معلوم نہیں دشنہ بلب تیغ بہ کف
میں نے ایسا تو کوئی حق نہیں مارا اس کا

کر دیے سارے دکھاوے کے چڑھاوے واپس
کوئی احسان تھا خود پہ نہ گوارا اس کا

بات پر کان تو ہر جنبشِ ابرو پہ نظر
جیسے ہم لوگوں پہ راحت ہو اجارا اس کا

راحت سرحدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

برے دنوں کے دکھی ساعتوں کے ساتھی ہیں
یہ لوگ بھی مرے غارت گروں کے ساتھی ہیں!

غزل

جل گیا چہرہ تو رنجش نہیں کی
صرف آئینے کی خواہش نہیں کی

ہم دلاور تو نہیں تھے لیکن
کوئی دھوکا کوئی سازش نہیں کی

مرتکب جرم کے بھی ہم نہ ہوئے
اور بچنے کی بھی کوشش نہیں کی

اس کا دکھ اپنے لئے مانگ لیا
ہم نے بیمار کی پرسش نہیں کی

ایک سا تجربہ کیا ڈہراتے
دوسری بار وہ لغزش نہیں کی

التجائیں بھی پلٹ آتی ہیں
سو کبھی ہم نے گذارش نہیں کی

صفدر صدیق رضی

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

کم نظر روتے رہے ہم نظروں کا رونا
دیکھتا کون ترے دیدہ وروں کا رونا

غزل

دھوپ کے اس دیار میں عمر گذار دی گئی
سایۂ زلفِ یار میں عمر گذار دی گئی

ناز رہا ہے عمر بھر ہم کو لباسِ عشق پر
دامنِ تار تار میں عمر گذار دی گئی

اپنی ہر ایک سانس سے آئے گلاب کی مہک
گیسوئے مشک بار میں عمر گذار دی گئی

اپنا ہر ایک پل یہاں تیری تلاش میں کٹا
کونجوں کی اک قطار میں عمر گذار دی گئی

موت نہ آ سکی ہمیں، موت کی آرزو رہی
موت کے انتظار میں عمر گذار دی گئی

غزلیں کہی ہزار ہا، پھر بھی نہ یہ سنور سکے
شعروں کے ہی نکھار میں عمر گذار دی گئی

ٹیکسوں کے داؤ پیچ تھے، بجٹوں کے ہیر پھیر تھے
لفظوں کے اک حصار میں عمر گذار دی گئی

پھول کی ایک پنکھڑی اپنے نصیب میں نہ تھی
جسم کے اس مزار میں عمر گزار دی گئی

پیاسوں کو ایک بوند بھی پانی کبھی نہیں ملا
وعدوں کے آبشار میں عمر گزار دی گئی

جسم کے پیڑ پر کبھی پات ہرا نہیں ہوا
اُجڑی ہوئی بہار میں عمر گذار دی گئی

آپ کے روبرو کبھی کھل کے نہ حالِ دل کہا
جذبوں کے اختصار میں عمر گذار دی گئی

کوفہ و شام و کربلا اور نجف کے ہم گدا
آلِ نبیؐ کے پیار میں عمر گذار دی گئی

عقیل رحمانی

غزلیں

عصرِ حاضر میں بھی نمرود بنا بیٹھا ہے
ایک پتھر ہے وہ معبود بنا بیٹھا ہے

ہم تری آگ کو گلزار بنا سکتے ہیں
تو بھڑکتا ہوا بارود بنا بیٹھا ہے

جو بنانا ہو بناتا ہے بنانے والا
جو بنا بیٹھا ہے بے سود بنا بیٹھا ہے

ہم اسے راہ کے پتھر کی طرح جانتے ہیں
اور وہ منزلِ مقصود بنا بیٹھا ہے

ڈھلنے والا ہے کسی قصۂ پارینہ میں
جو ابھی لمحۂ موجود بنا بیٹھا ہے

حال احوال شب و روز بتاتے ہیں ہمیں
اب ایاز آپ ہی محمود بنا بیٹھا ہے

نام ہوتا ہے کہاں نام کے رکھ لینے سے
تو بھی تو مفت میں مسعود بنا بیٹھا ہے

مسعود احمد

دھڑا دھڑ لوگ غائب ہو رہے ہیں
بڑی عجلت میں تائب ہو رہے ہیں

خدا ہم سے بہت اکتا چکا ہے
پرندے اسکے نائب ہو رہے ہیں

وہی جو چھوٹے مسئلے تھے
جواں کڑیل مصائب ہو رہے ہیں

کسی پر کیا کھلیں گی خوبیاں یہ
اجاگر سب معائب ہو رہے ہیں

یہ سارا گھر عجائب گھر ہوا ہے
یہاں کیا کیا عجائب ہو رہے ہیں

جہاں ہر شخص مشکل میں گھرا ہے
وہاں کچھ لوگ صائب ہو رہے ہیں

مبارک ہو ہمارا خون پی کر
درندے توبہ تائب ہو رہے ہیں

غزل

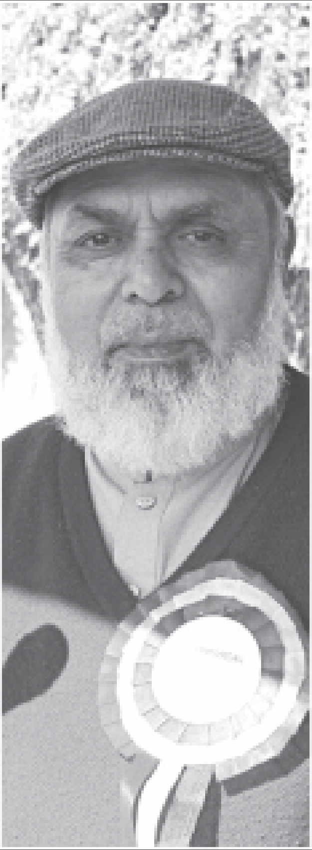

آگ جو مجھ میں بھڑکتی تھی ، بجھا دی گئی کیا
مری مٹی بھی ہواؤں میں اڑا دی گئی کیا

یہ جو قاتل کو عدالت نے بری کر ڈالا
یہ بھی مقتول کے بچوں کو سزا دی گئی کیا

ترے گھر کے در و دیوار مجھے بھول گئے
مری تصویر بھی کمرے سے ہٹا دی گئی کیا

تجھے کس نے سرِ بازارِ وفا بھیجا تھا
اے مرے دل تری قیمت بھی گھٹا دی گئی کیا

موسمِ ترکِ تعلق کا تو امکاں ہی نہ تھا
اَن کہی بات کو دانستہ ہوا دی گئی کیا

موت کے گھاٹ اُترنا ہے جنھیں جانِ انیس!
جرم کی فرد انھیں پڑھ کے سنا دی گئی کیا

محمد انیس انصاری

انتخاب

خالد احمد

یہ ہاتھ ہیں کچھ برتے سے یہ ساتھ ہیں کچھ دیکھے سے
یہ دن تو نہیں دیکھا سا ، حالات ہیں کچھ دیکھے سے

نعمان منظور

غزلیں

ہمیں تو کچھ نہیں کہتی ہے جگ ہنسائی بھی
ہمارے ساتھ ہے چمٹی ہوئی گدائی بھی

سبق ہمارا مکمل ہوا ہے آخرکار
کہ ہم نے دیکھ لی دنیا کی بے وفائی بھی

یہ شہر والے ہیں ان کو کسی سے کیا مطلب
کسی نے خاک اگر دشت میں اڑائی بھی

تمام شہر میں بکھری پڑی ہیں لاشیں اور
ہے جاری امن پسندوں کی کارروائی بھی

یہ لعن طعن کی دانش یہ چیختے لہجے
کہ ان کی بات سے بہتر ہے بے نوائی بھی

عدو تو خندہ بلب ہیں ہمارے سجدوں پر
ہمیں عزیز مگر ان کی خوش افزائی بھی

عرب سے سعد جی بہتر ہوئے عجم والے
کہ دشمنوں سے عرب کی ہے آشنائی بھی

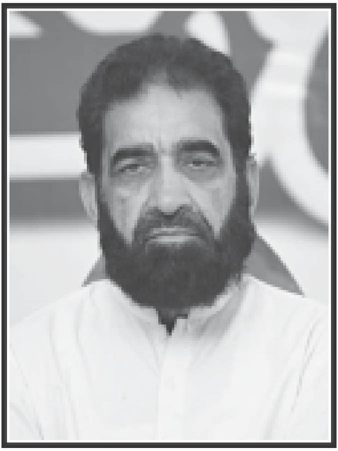

سعداللہ شاہ

حیثیت کیا کسی غلام کی ہے
یہ حکومت تو سمجھ نام کی ہے

لفظ سیکھو کہ ہے دوام اس میں
ورنہ دنیا تو رم دام کی ہے

پاؤں رکھا نہیں زینے پر
فکر لاحق مگر مقام کی ہے

جبر پلتا ہے اپنے بچوں سمیت
یہی خوبی تو اس نظام کی ہے

روز جیتا ہوں روز مرتا ہوں
یہ مشقت تو صبح شام کی ہے

سانپ پلتے ہیں جس خزانے پر
وہ امانت مرے عوام کی ہے

سعد شہرت پہ مان کرتے ہو
یہ جسارت خیال خام کی ہے

غزل

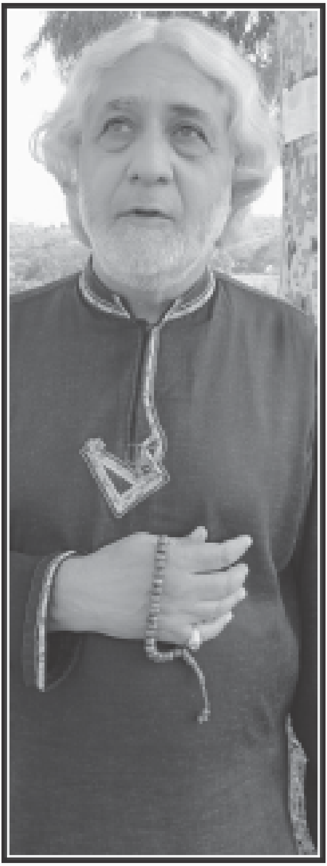

گو ستارے اور کچھ مہتاب میرے ساتھ تھے
میں اکیلا تو نہیں تھا خواب میرے ساتھ تھے

ہارنے کے بعد میں بالکل اکیلا رہ گیا
جیت جاتا گر میں تو احباب میرے ساتھ تھے

جب تلک خوشحال تھا سب داد دیتے تھے مجھے
زیست کے کچھ ریشم و کمخواب میرے ساتھ تھے

لوگ سمجھے پانیوں کو میں ہی لایا ہوں یہاں
ڈوب کر نکلا تو کچھ سیلاب میرے ساتھ تھے

سامنے دشمن کے جب ڈٹ کر کھڑا میں ہو گیا
کون تھا ہمراہ بس، اعصاب میرے ساتھ تھے

ہاتھ میں کنکر لیے اقبال گھر سے چل پڑا
چاند کے سب عکس اور تالاب میرے ساتھ تھے

اقبال سروبہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نہ دکھ کی موج ہی سمجھے نہ چپ کی خو جانے
وہ دل کو درد بتائے وہ گل کو بو جانے

غزل

نہ کامرانی کوئی اور نہ رائگانی کوئی
یہاں سے جاتے ہوئے شے نہیں اُٹھانی کوئی

ہزار آب وضاحت سے دھوئیں ڈھلتی نہیں
جو دِل میں بیٹھ گئی چھپ کے بدگمانی کوئی

تمام شہر کے پیاسے وہیں تو ملتے تھے
گلی کے نلکے پہ بھرتا تھا آ کے پانی کوئی

لڑکپنے کی محبت تھی کچھ پتا ہی نہ تھا
ہمی سنبھال کے رکھتے تری نشانی کوئی

وہ بے نیاز کبھی ہنس کے بات کر ہی لے
توقعات بنا لیتی ہیں کہانی کوئی

ہمارے اپنے بیاباں ہیں اور کھنڈر اپنے
یہیں پہ پھرتی ہے اک روح بھی پرانی کوئی

یہ تجھ پہ جس طرح پروانہ وار مرتے ہیں
بتاؤ ایسے لُٹاتا ہے کیا جوانی کوئی

تب ایسے تھے نہیں جیسے دکھائی پڑتے ہیں
دکھاتے ہیں تمھیں تصویر ہم پرانی کوئی

مگر ہمیں تو غلاموں میں بھی نہیں رکھتا
ہمارے نام پہ کرتا ہے حکمرانی کوئی

وہی شکستہ سا دل لے کے آ گئے چپ چاپ
پھر اس میں بھر گیا چپکے سے بے کرانی کوئی

کسی پہ گھل کے اُترتی ہے اُس کے روپ کی دھوپ
کسی کی شام بھی کرتا نہیں سہانی کوئی

کرے گا خضر کو آمادۂ فنا اک دن
فنا پذیروں کو بخشے گا جاودانی کوئی

بنانے والے نے اس میں کشش ہی وا رکھی
تو کیسے چھوڑ کے جائے جہانِ فانی کوئی

واجد امیر

غزل

تنہائیوں پر اتنا میں حیران نہیں تھا
یوں دل مرا پہلے کبھی ویران نہیں تھا

دن رات لٹیں کھولے ہوئے روتی ہے دل میں
اس درجہ اداسی کا تو امکان نہیں تھا

میں ڈوب گیا وقت کے دریا میں اچانک
لہروں کی روانی پہ مرا دھیان نہیں تھا

پھیلا ہوا اک قحطِ محبت تھا گھروں میں
لیکن کوئی بھی شخص پریشان نہیں تھا

کمروں کی گھٹن کھا گئی بچوں کی شرارت
دیواریں تھی اور روزن و دالان نہیں تھا

میں لہجوں کے اس مقتلِ احساس میں اے دوست
آوازوں کی خوں ریزی سے انجان نہیں تھا

زندہ ہوں میں حیرت کے سمندر میں ابھی تک
وہ مشکلیں تھی بچنا تو آسان نہیں تھا

کم گو تھے بہت پہلے بھی اس شہر کے باسی
ماحول مگر ایسا بھی سنسان نہیں تھا

سلیم فگار

غزل

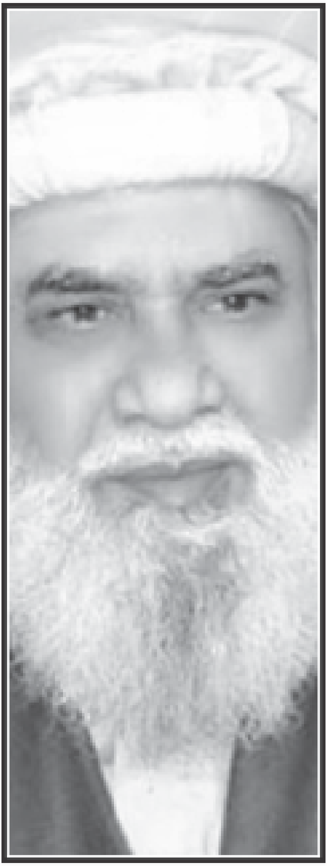

اکرم ناصر

سارا قصہ، سب کہانی، سب فسانہ کہہ گئے
اشک کیا آنکھوں سے نکلے، جیسے دریا بہہ گئے

میں سدا تعبیر کی لذت سے بیگانہ رہا
میرے سارے خواب میرے آنسوؤں میں بہہ گئے

جب کبھی آیا درِ کعبہ پہ جانے کا خیال
میرے پاؤں میری چادر سے الجھ کے رہ گئے

ظلِ سبحانی کی باری آ گئی ہے آخرش
ہم تو اب تک ہونے والے ظلم سارے سہہ گئے

ہاں حویلی کچھ نہ کچھ تو بچ گئی سیلاب میں
اور جو کچے مکاں تھے وہ تو سارے بہہ گئے

فیصلہ آیا تھا دونوں کی توقع کے خلاف
ہم تو ششدر تھے ہی اکرم وہ بھی ششدر رہ گئے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گوہرِ معنی کہاں ؟ تُو کس لیے خالد
بحرِ سخن لہر لہر چھان رہا ہے

غزل

کاوشِ عشق ابھی تک نہیں ڈھب پر آئی
سامنا ہو گیا تو بات نہ لب پر آئی

کون سی آنکھ ہے جو حسن میں سرشار نہیں
تہمتِ عشقِ بتاں دوستو سب پر آئی

تیرے آنے سے ہوئی صورتِ حالات حسیں
نور کی بدلی سی پھر محفلِ شب پر آئی

حشر میں خالق و مالک، تری رحمت، بخشش
غالب آخر کو تیرے غیظ و غضب پر آئی

جو کبھی آئی تھی اس جانِ بہاراں کے طفیل
ایسی رونق کہاں پھر باغ عرب پر آئی

جب رضا مانگ لیا میں نے اسی کو اس سے
پھر تو اس کو بھی ہنسی میری طلب پر آئی

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لے جائیں گی کہاں مجھے تنہائیاں مری
وسعت پذیر ہیں ابھی پہنائیاں مری

غزل

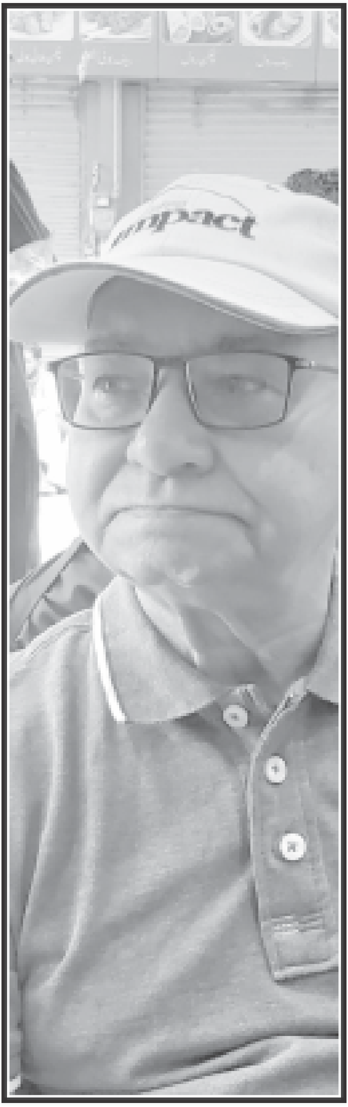

ایک چہرہ ہے میری آنکھوں میں
چاند ٹھہرا ہے میری آنکھوں میں

کیوں جھپکتیں نہیں مری پلکیں
کس کا پہرہ ہے میری آنکھوں میں

خشک دریا ہے ، خشک جھیلیں ہیں
خشک صحرا ہے میری آنکھوں میں

میری بینائی لمس کی پیاسی
اور گہرا ہے میری آنکھوں میں

ایک آنسو خوشی کا ، رنج کا ہے
عکس دُہرا ہے میری آنکھوں میں

چیختا پھر رہا ہے سناٹا
خوف ، بہرا ہے میری آنکھوں میں

سُرخیٔ شام کا نظارہ دیکھ
زخم گہرا ہے میری آنکھوں میں

اجمل اعجاز

غزل

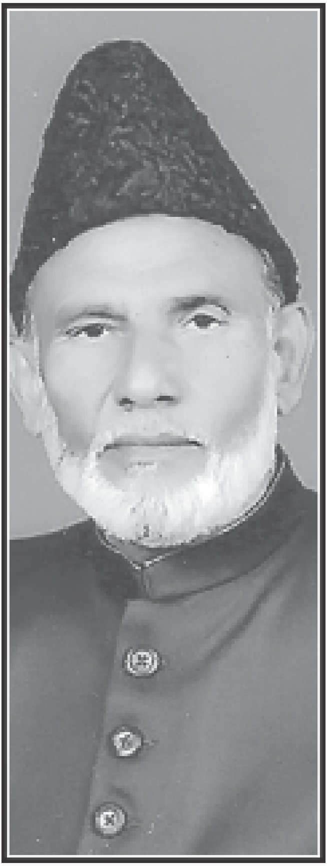

پھولوں نے بات دست صبا تھام تھام کی
آئی تھی پیشوائی کو اس خوش خرام کی

کس خوش دلی سے یاروں میں بانٹی منافقت
ڈھنڈیا پڑی ہوئی ہے اسی نیک نام کی

لائے وہ کھینچ کھانچ کے سیلاب کو ادھر
کٹیا ہماری جو تھی بنی خشت خام کی

ساغر ہمارے ہاتھ میں آنے سے رہ گیا
بنتی نہیں ہے اوک سے مینا و جام کی

نوکِ مژہ سے کھل گئے زخمِ جگر مگر
تیرِ نظر نے عمرِ خضر بھی تمام کی

نظارۂ جمال سے ساجد کی عید ہے
کیفیتیں نہ پوچھ مری صبح و شام کی

شریف ساجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اس چھت سے کبھی دھوپ اُترتی نہیں خالد
عزت تو یہ دیتے ہیں گھرانے نہیں دیتے

غزل

پھر کسی صبحِ نہایت میں ملوں گا تم کو
میں نئی عمر کی مدت میں ملوں گا تم کو

تم مرے واسطے زنجیر اُٹھا لائے ہو
قید اپنی کسی عادت میں ملوں گا تم کو

چند متروک مصارع ہیں شکستہ الفاظ
شعر کہنے کی ریاضت میں ملوں گا تم کو

گھر بنانے کی مشقت سے نکل آیا ہوں
گھر چلانے کی مشقت میں ملوں گا تم کو

مستقل وقت ہے، میں ہوں، نہ تو تم ہو صاحب
عارضی ہیں سو میں عجلت میں ملوں گا تم کو

قرمزی رنگ کا اک لطف ہوں جو پل دو پل
ساحلی شام کی رنگت میں ملوں گا تم کو

تم تو تدبیر سے تقدیر بنا لیتے ہو
جس قدر لکھا ہے قسمت میں، ملوں گا تم کو

بس یہی تمیں کہ پینتیس برس کی مہلت
کام نمٹا لوں تو فرصت میں ملوں گا تم کو

اسی دیوار سے میں نے کبھی سر پھوڑا تھا
اینٹ کے لمس کی لذت میں ملوں گا تم کو

کچھ فقط حاشیہ بردار ہوا کرتے ہیں
اس روایت کی درایت میں ملوں گا تم کو

یوں تو یہ جسم بھی مٹی ہے سراسر مٹی
جسم پر نور کی تہمت میں ملوں گا تم کو

آئنہ خانہ پرانا ہے، پرانی حیرت
عکسِ آئندہ ہوں، جدت میں ملوں گا تم کو

منظر اعجاز منظر

غزلیں

غم کے ماروں کی میزبانی کا
شکریہ تیری مہربانی کا

تیری گاگر کی خیر ہو لیکن
سانس رکنے لگا ہے پانی کا

ہم تو خود سے بھی کہہ نہیں سکتے
یہ جو قصہ ہے رائگانی کا

ہم بھی کردار بننے والے ہیں
بھولی بسری ہوئی کہانی کا

ہم مکانوں میں قید لوگوں کو
درد اٹھتا ہے لامکانی کا

کوئی نعم البدل نہیں شاہد
میرے صحرا کی بیکرانی کا

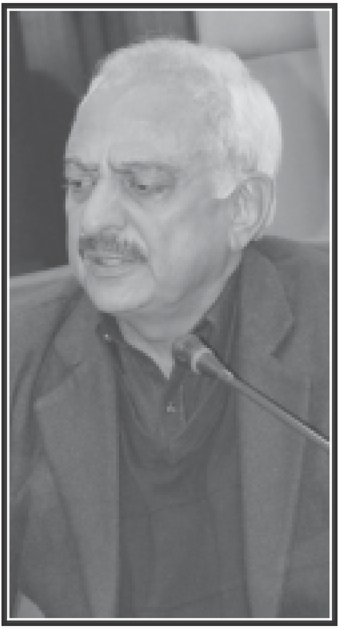

افتخار شاہد

مری خواہش ہے کہ ہر شخص خسارے سے بچے
مری کوشش ہے کسی شخص کا نقصان نہ ہو

آپ کا تیر نشانے پہ لگے یا نہ لگے
میرے بچنے کا مگر کوئی بھی امکان نہ ہو

خواب کے پار اتر جائیں کسی روز مگر
پار اتریں تو ادھر کوئی پرستان نہ ہو

ایک ہی بار محبت کی یہ تعزیر لگے
دوسری بار کبھی آپ کا چالان نہ ہو

عمر کٹ جائے کسی گوشۂ تنہائی میں
ہم کو دکھنے یا دکھانے کا بھی ارمان نہ ہو

غزل

نظر کو نور تو دل کو گلاب کرتے ہیں
تمہاری یاد کو جب ہم رکاب کرتے ہیں

یہ سود اور زیاں کا گلہ بجا، لیکن
کبھی ملو کہیں بیٹھو، حساب کرتے ہیں

تمہارا ذکر کبھی صوتِ نغمگی بن کر
زمیں پہ ہم تو فلک پر سحاب کرتے ہیں

شبِ ملال سے لے کر شبِ وصال تلک
جو کام ہم نہیں کرتے وہ خواب کرتے ہیں

تمہارا نام جو آتا ہے داستاں میں مری
کنول کے پھول لبِ زیرِ آب کرتے ہیں

افروز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ سجھائی نہیں دیتا پسِ دیوارِ بکا
کون سنتا ہے ترے خیرہ سروں کا رونا

غزلیں

افتخار الحق

سمجھ میں آئے جہاں سے مرا سفر مجھ کو
ملا نہیں ہے ابھی تک وہ مستقر مجھ کو

قنوطیت ہے کہ یہ انکشاف ہے کوئی
طویل عمر بھی لگتی ہے مختصر مجھ کو

جو میری گردشِ قسمت کو غور سے دیکھیں
امام مان لیں دریاؤں کے بھنور مجھ کو

میں ریگ زارِ جنوں میں مقیم ذرّہ ہوں
ہوائے عقل اُڑا لے چلی کدھر مجھ کو

میں برگِ سبز ہوں اتنا کہ شاخ لگتا ہے
سو چاہ کر بھی گراتا نہیں شجر مجھ کو

سراب خوش نظری ہے کہ خود فریبی ہے
دکھائی دیتا ہے ہر شخص معتبر مجھ کو

میں اب خلاؤں سے بھرپور کیوں دکھائی نہ دوں
پلٹ کے دیکھا نہیں اس نے لمحہ بھر مجھ کو

حجاب وقت ہٹا کر زمیں کو جب دیکھا
جو رہ گزر نظر آئی، لگی خضر مجھ کو

کبھی کبھی کا تعیّن ہو میری مرضی سے
کبھی کبھی تو جدا ہو، اداس کر مجھ کو

جہاں سے ابر کے امکاں مٹائے جاتے ہیں
ہم ایسے دشت میں پودے لگائے جاتے ہیں

جہاں عدم بھی گزرنے سے ہچکچاتا ہے
ہم اس جہان میں امکاں بسائے جاتے ہیں

ہمارے چشمۂ فرہاد کب کے سوکھ چکے
ہمیں پہ تیشے مگر آزمائے جاتے ہیں

جو آسمانِ وفا سے الجھ کے گر جائیں
وہی زمینِ وفا پر سجائے جاتے ہیں

ہمیں بنائی ہے خانہ بدوش ریگِ حیات
ہمارے شہر میں صحرا بسائے جاتے ہیں

ہم اپنی مرضی سے بنتے ہیں حرفِ نو اور پھر
بھلائے جاتے ہیں لکھ کر مٹائے جاتے ہیں

ہماری رات میں وحشت اجالنے کے لیے
چراغ طاق ہوا میں جلائے جاتے ہیں!!

جنھیں ہماری طرف دیکھ کر ہو تم ناخوش
وہ آس پاس تمھارے بھی پائے جاتے ہیں

غزلیں

چاہیے دل کو تحفظات تو ہیں
پھر بھی ہم دونوں ساتھ سات تو ہیں

شاخِ امید کچھ ہری ہے ابھی
اس پہ کچھ اب بھی پھول پات تو ہیں

اب تو درکار کچھ لکیریں ہیں
پاس اپنے یہ خالی ہات تو ہیں

مقصدِ کائنات پوچھتے ہو
آقاؐ مقصودِ کائنات تو ہیں

منزلیں ہم کو ڈھونڈ ہی لیں گی
گو تعاقب میں حادثات تو ہیں

مہر و ماہ و نجوم سارے ہی
اس کے آگے جلیل مات تو ہیں

احمد جلیل

محبتوں کا کہیں بھی نگر نہیں ملا ہے
تلاش ہار گئی ہے مگر نہیں ملا ہے

میں انقلاب کے چنے بنوں تو کیسے بنوں
کہ تیری راکھ میں کوئی شرر نہیں ملا ہے

ہمارے عہد میں قحط الرجال ہے ہر سو
کہ دور تک کہیں اہلِ نظر نہیں ملا ہے

میں جل رہا ہوں زمانوں سے دھوپ موسم میں
کہ دشتِ جان میں کوئی شجر نہیں ملا ہے

ہماری جستجو میں منزلیں تو ہیں اب بھی
یہ اور بات کوئی راہبر نہیں ملا ہے

جلیل مقتلِ جاں میں بھی صلیبوں پر
حوالہ تجھ سے کوئی معتبر نہیں ملا ہے

غزل

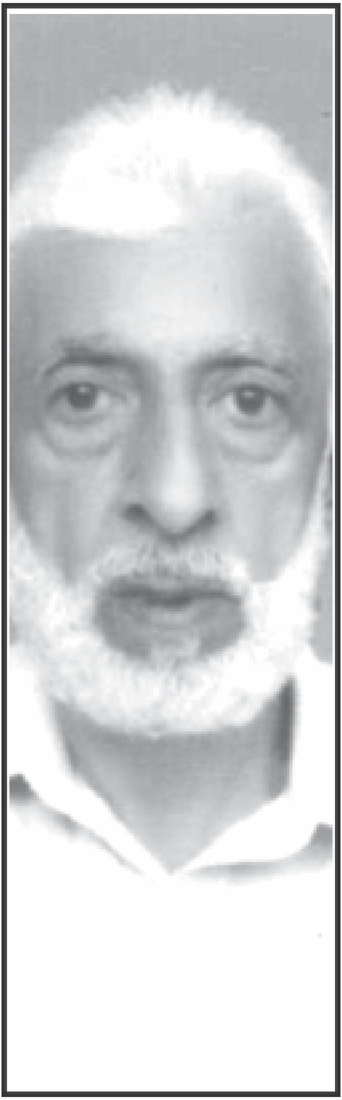

ہمایوں پرویز شاہد

دُکھوں کی دُھوپ میں جو سائباں بناتے ہیں
دیارِ دل میں وہی آستاں بناتے ہیں

خراب حالوں کو بخشیں سکون دائم جو
چلو کے جس میں وہ کھڑکیاں بناتے ہیں

شکست دیتی ہیں آخر جو زرد لمحوں کو
وفا پرست وہی تتلیاں بناتے ہیں

وہ اپنے عہد کا ہوتے ہیں فخر اے صاحب
جو منزلوں کے لیے کارواں بناتے ہیں

ہماری بات کوئی اس لیے نہیں سُنتا
کہ حرف حرف کو ہم کو داستاں بناتے ہیں

وہی تو ہوتے ہیں تنکا جہاں کی آنکھوں میں
جو تنکے تنکے سے اِک آشیاں بناتے ہیں

مجھے ہے فخر میں اُن کا غلام ہوں شاہد
زمیں کے ذرّوں کو جو کہکشاں بناتے ہیں

غزلیں

جب تک ترا خیال ہے اس دل کے آس پاس
پتھر گریں گے پھر ترے سائل کے آس پاس

پہلے بھنور کے بیچ میں لا کر ڈبو دیا
پھرتے ہیں اب ملول سے ساحل کے آس پاس

رہزن سے مل گیا ہو جہاں میرِ کارواں
لٹتے ہیں پھر تو قافلے منزل کے آس پاس

تیرہ شبی میں دیکھی گئی ہے نویدِ صبح
آسانیوں کو دیکھا ہے مشکل کے آس پاس

مانا، مثالِ ماہ ہیں عارض جناب کے
لیکن، نگاہ گھومتی ہے تل کے آس پاس

مقتول، جانے کب سے پڑا ہے زمین پر
اک شورِ آفرین ہے قاتل کے آس پاس

مجنوں کا پھر نصیب ہیں شوکت صعوبتیں
دیکھا گیا ہے پھر اسے محمل کے آس پاس

شوکت محمود شوکت

اک شورِ قیامت ہے بپا، دیکھیے کیا ہو؟
ہر شخص لگے خود سے خفا، دیکھیے کیا ہو؟

ہر سمت، عداوت ہے، تکبر ہے، انا ہے
ہے اوج پہ ہر سمت جفا، دیکھیے کیا ہو؟

لگتا ہے کہ اطراف میں بارود کی بو ہے
لگتا ہے، مکدر ہے فضا، دیکھیے کیا ہو؟

پھر تیرہ شبی عود کے آئی ہے سرِ شام
شاید کہ دیا بجھنے لگا، دیکھیے کیا ہو؟

مدت سے تری بزم میں خاموش تھا، لیکن
لے آیا ہے اب لب پہ گلہ، دیکھیے کیا ہو؟

پھر دھوپ کی شدت نے جنوں خیز کیا ہے
پھر چلنے لگی گرم ہوا، دیکھیے کیا ہو؟

وہ عالمِ وحشت ہے بھرے شہر میں شوکت
سنتا ہی نہیں کوئی صدا، دیکھیے کیا ہو؟

غزل

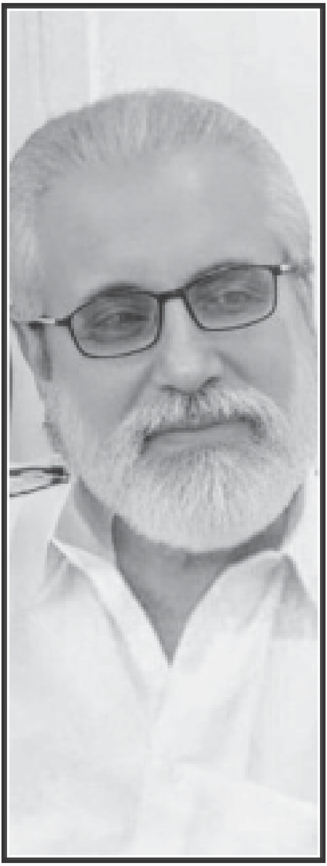

چھیڑ نہ واعظ دور کا قصہ
رہنے دے اب حور کا قصہ

تیری آنکھ میں سرمہ دیکھا
یاد آیا پھر طور کا قصہ

زر داروں کی اس دنیا میں
کون سنے مزدور کا قصہ

تیرے رخ سے آنچل سرکا
چھڑ گیا ہر جا ، نور کا قصہ

بھول نہ پایا سندر چہرہ
یاد ہے اک مغرور کا قصہ

یار افضل اب رہنے بھی دو
کون سنے مجبور کا قصہ

افضل ہزاروی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یُوں ملاقاتیں اُدھوری چھوڑ کر جاتے نہ تھے
تم تو میری دُکھ بھری باتوں سے اکتاتے نہ تھے

غزل

لفظ کھوئے ہیں اسی کو من کا اجلا بول کر
بانٹتا ہے درد جو ، خود کو مسیحا بول کر

خون بھی ہم رنگ تھا اور درد بھی تھا ایک سا
کیوں ہوا پھر بدگماں وہ مجھ کو اپنا بول کر

جاتے جاتے جائے گا یہ بدگمانی کا اثر
خود کو تنہا کر گیا ہے مجھ کو تنہا بول کر

میری چپ نے کردیا بس میرے دل کا فیصلہ
خود کو ہی رسوا کیا ہے مجھ کو جھوٹا بول کر

یاد رکھنا وقت کا ہر وار کاری ہوتا ہے
شاہ گرتے دیکھے ہیں یاں بول اونچا بول کر

آج تک جس کو میں سمجھی تھی کہ وہ کچھ خاص ہے
دل میں رہنے والا بھی پھر دل سے اترا بول کر

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک شجر کے کوئی دو پتے بھی اک جیسے نہ تھے
میری دنیا میں کسی شے کا کوئی ثانی نہیں

غزل

اپنا سایہ اٹھا کے رکھتے ہیں
دھوپ تن میں بسا کے رکھتے ہیں

ایک دریا قریب بہتا ہے
ایک دریا بہا کے رکھتے ہیں

ایک ویران گھر میں رہتے ہوئے
ایک بستی بسا کے رکھتے ہیں

جب سے میرے چراغ جلنے لگے
لوگ چہرہ چھپا کے رکھتے ہیں

جن کی آنکھوں میں خواب کھلتے ہیں
ہم سے کب وہ بنا کے رکھتے ہیں

سبز رستوں پہ چلنے والے ہی
گیلی لکڑی جلا کے رکھتے ہیں

ایک رستہ نظر سے اوجھل ہے
ایک رستہ سجا کے رکھتے ہیں

دل کے آنگن کے آج بھی احسن
دیپ سارے جلا کے رکھتے ہیں

شکور احسن

غزل

دل ہوا پھر سے مبتلا شاید
ہے نئے غم کی ابتدا شاید

تجھ کو برسوں ہنسی نہیں آتی
تُو بھی ہے درد آشنا شاید

کل جو لازم تھا آج خارج ہے
اس کو کہتے ہیں ارتقا شاید

واہموں کی صدائیں چیختی ہیں
ہو گیا ہے وہ بے وفا شاید

آنکھ تک اشک جو نہیں آیا
درد کی ہے یہ انتہا شاید

ہم نے ہر عزم ٹوٹتا دیکھا
ہوتا ہو گا یہ دیرپا شاید

اتنی مجبوریاں ہیں راہوں میں
چل سکے گا یہ سلسلہ شاید

آپ کی کج روی سے لگتا ہے
بھا گیا کوئی دوسرا شاید

روح کے گھاؤ بن گئے ناسور
زخمِ دل بھی ہے لادوا شاید

خالدہ انور

غزل

بیٹھ جاتا ہوں جو لگ کر کسی دیوار کے ساتھ
لوگ کرتے ہیں تماشا مرے کردار کے ساتھ

وعدہ تنہائی میں ملنے کا وفا ہو کیسے
دونوں جانب تو فرشتے ہیں گنہگار کے ساتھ

آئے کچھ دوست مرے دل کے مدینے میں نئے
یعنی دو چار مہاجر بھی ہیں انصار کے ساتھ

پوچھ کر حال سبھی دوست چلے جاتے ہیں
رات بھر کوئی نہیں جاگتا بیمار کے ساتھ

ناخدا کوئی نہیں راہ نما کوئی نہیں
ناؤ طوفاں میں ہے ٹوٹے ہوئے چپوار کے ساتھ

منزلیں اُس کے قدم چوم لیا کرتی ہیں
جو مسافر بھی چلے وقت کی رفتار کے ساتھ

جابرِ وقت سے کہہ دو وہ سجائے مقتل
جھک نہیں سکتا یہ سر جائے گا دستار کے ساتھ

آگ برسی تو پرندوں کے ٹھکانے بھی گئے
جل بجھے گھونسلے جلتے ہوئے اشجار کے ساتھ

بیج نفرت کے نہ بو اس کی ضرورت کیا ہے
جھاڑیاں خود ہی اُگا کرتی ہیں اشجار کے ساتھ

یوں نبھائی ہے سحرؔ رسمِ وفا گلشن میں
پھول جس طرح نبھاتا ہے کسی خار کے ساتھ

اکرم سحر فارانی

غزل

شمشیر حیدر

سجدۂ شکر بجا لائے جو ہر تیر کے بعد
کوئی شبیر سے پہلے تھا نہ شبیر کے بعد

کربلا رستہ دکھانے کے لیے کافی ہے
کچھ نہیں چاہیے اس درد کی جاگیر کے بعد

تجھ کو سوچا تو ترا عشق وہاں لے آیا
کوئی آتا ہے جہاں کوشش و تدبیر کے بعد

یا نبی کوئی نہیں ہے ترے اکبر جیسا
کوئی تصویر نہیں ہے تری تصویر کے بعد

کوئی سجاد کو رستے میں نہ پہچان سکا
کتنا تبدیل ہوا درد کی تاثیر کے بعد

دل پہ اک نام لکھا نامِ حسین ابنِ علی
اور پھر کچھ نہ لکھا اسمِ ابدگیر کے بعد

در الطاف ہے اس کے لیے بھی فیض رساں
حر بظاہر جو ادھر آیا ہے تاخیر کے بعد

پیاس کا مارا ہوا جیسے ہی سجدے میں گیا
ہر لعیں ٹوٹ پڑا نعرۂ تکبیر کے بعد

غزل

جاگتی آنکھوں سے جو دیکھا تھا سپنا رہ گیا
زندگانی میں تمہارے جبر سہتا رہ گیا

سوچتا ہوں اب کہاں جا کے میں بیچوں گا خلوص
کس پرانے وقت کا بٹوے میں سکہ رہ گیا

پھر کوئی کردار الجھا ہے کہانی کار سے
چاہتوں کا پھر ادھورا اک فسانہ رہ گیا

مجھ کو آیا ہی نہیں ہے زندگی جینے کا ڈھب
موسمِ گل میں پرندوں کو اُڑاتا رہ گیا

وہ عدو سے مل گیا ہے جس پہ تجھ کو ناز تھا
اب بتا کس کام کا تیرا بھروسہ رہ گیا

ایسا لگتا ہے کہ اس کو ہار جاؤں گا کبھی
گر ذرا سی بات کو دل سے لگاتا رہ گیا

وقت کی آندھی اُڑا کے لے گئی سب حسرتیں
اور ہاتھوں پر کسی کا نام لکھا رہ گیا

شام ڈھلنے کو ہے ارشد اب تو سوچے بھی تو کیا
کونسی چوٹی ہوئی سر اور کیا کیا رہ گیا

لوگ ملتے تو رہے دو چار لمحوں کے لیے
دل ادھورا تھا ازل سے وہ ادھورا رہ گیا

اور کوئی آ گیا تھا مرکزی کردار میں
میں کتابِ زیست کا عنوان بنتا رہ گیا

پَر نکل آئیں تو پنچھی اُڑ ہی جاتے ہیں میاں
دیکھ لو خالی تمہارے دل کا پنجرہ رہ گیا

ارشد محمود ارشد

غزل

میرے کہنے پہ اگر تُو نے بغاوت کی ہے
دیکھ! میں نے بھی فقط تجھ سے محبت کی ہے

جوق در جوق مرے گھر میں پرندے اترے
میں نے اشجار کے کٹنے کی مذمت کی ہے

میں جو دیتا ہوں دکھائی تمہیں ہر حال میں خوش
ایک عرصہ میں نے ہنسنے کی ریاضت کی ہے

اب تو غم بھی مجھے بچوں کی طرح لگتے ہیں
میں نے اشکوں سے ترے غم کی کِفالت کی ہے

تجھ پہ الزام نہ آئے مری بربادی کا
اس لیے گاؤں سے ہنستے ہوئے ہجرت کی ہے

تیرے پُرکھوں نے جسے پاس بٹھایا نہ کبھی
اور تُو ہے کہ اُسی شخص کی بیعت کی ہے

لازمی تھا مری بینائی کا مدھم پڑنا
آنکھ سورج کو دکھانے کی جسارت کی ہے

یونہی چہرے پہ اداسی نہیں آئی اکمل
میں نے روتے ہوئے چہروں کی تلاوت کی ہے

اکمل حنیف

غزل

ظلم کی تُو نے ابتدا کی ہے
جو گرفتار یوں ہوا کی ہے

موت گو سانولی سلونی ہے
دل کشی اس میں پر بلا کی ہے

کوئی اچھی بری نہیں ہوتی
ساری تخلیق اس خدا کی ہے

کوئی حد ود نہیں محبت میں
تُو نے تو خیر انتہا کی ہے

ساز و آہنگ گو نیا ہے مگر
صوت و آواز آشنا کی ہے

شعر اچھا برا نہیں ہوتا
بات ساری مگر فضا کی ہے

ان سنی تو نے کی تری مرضی
میرے دل نے مگر صدا کی ہے

دل پہ رکھتا ہے پیر ہولے سے
یہ ادا اس گریز پا کی ہے

ایک دیوار ہے ہمارے بیچ
اور دیوار بھی انا کی ہے

آئے ہو اب مجھے سزا دینے
جب ضرورت مجھے دعا کی ہے

اصغر علی بلوچ

غزل

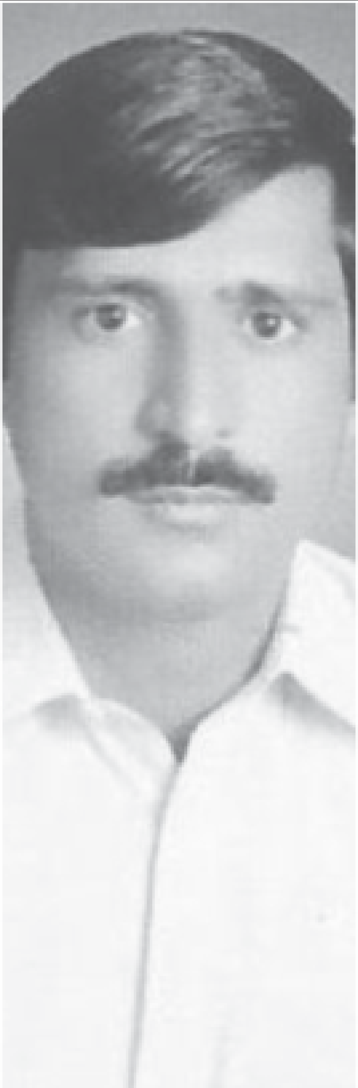

تعلق تجھ سے گو رکھنا پڑا ہے
مگر سودا بہت مہنگا پڑا ہے

مجھے مجبور ہو کر دل کے ہاتھوں
تری محفل سے اٹھ جانا پڑا ہے

کبھی دریاؤں کی یہ رہ گزر تھا
مرے رستے میں جو صحرا پڑا ہے

خدا جانے گھٹا برسے نہ برسے
مرے دل کا شجر سوکھا پڑا ہے

مرا دل توڑ کر وہ پوچھتے ہیں
بتاؤ راستے میں کیا پڑا ہے ؟

مجھے جینے کی خواہش تو نہیں تھی
تری خاطر مگر جینا پڑا ہے

میں جاؤں تو کہاں اب جاؤں دانش
مرے پیچھے مرا سایا پڑا ہے

اعجاز دانش

غزلیں

میں چپ ہوں تو برابر چیختا ہے
نہ جانے کون اندر چیختا ہے

یہ دل ہے اس پہ اتنی برہمی کیوں
یہ بے چارہ تو اکثر چیختا ہے

مرے اندر کوئی سہما پڑا ہے
مرے اطراف اک ڈر چیختا ہے

چمن میں خوف کا پہرہ لگا ہے
ہوا خاموش منظر چیختا ہے

تو ڈر آیا ہے میرے دائرے میں
لے تو بھی دیکھ پتھر چیختا ہے

سسکتا ہے کوئی تکیے کے نیچے
میں سو جاؤں تو بستر چیختا ہے

اسی نے تو مجھے آوارگی دی
گلی میں بھی یہ شب بھر چیختا ہے

یہ سناٹا ہے یا ہے خوف کوئی
یہ کیا اوصاف گھر گھر چیختا ہے

اوصاف شیخ

اس پر گہرے پردے لٹکے رہتے ہیں
جس کھڑکی میں میرے سپنے رہتے ہیں

کس کونے میں تیری یاد کو رکھوں میں
چھوٹا گھر ہے بیوی بچے رہتے ہیں

اتنی خاموشی ہے کہ ڈر لگتا ہے
گلی میں جیسے گونگے، بہرے رہتے ہیں

ایسا سناٹا بستی میں چیختا ہے
بچے تو کیا بوڑھے سہمے رہتے ہیں

نیند پڑی رہتی ہے روشن دانوں میں
اور آنگن میں سپنے بکھرے رہتے ہیں

غزل

ہونا تھا جو ہو چکا خود کو رُلا کر کیا کروں
زیست کے دکھ درد پر آنسو بہا کر کیا کروں

بجلیاں رہتی ہوں ہر دم جس شجر کی تاک میں
اُس شجر پر آشیاں اپنا بنا کر کیا کروں

جب مجھے معلوم ہے میرا مقدر ہے قفس
پھر فضاؤں کی طرف نظریں اُٹھا کر کیا کروں

جب ترے ہونٹوں پہ کِھل پائے نہ خوشیوں کے گُلاب
ناز نخرے میں زمانے کے اُٹھا کر کیا کروں

ہو چکے محروم سب جو دولتِ احساس سے
داستانِ کرب لوگوں کو سنا کر کیا کروں

جب حریفوں کی صفوں میں اپنے ہی آئیں نظر
میں زیادہ بھی قدم اپنے جما کر کیا کروں

سب کو اندازہ ہے میرے قد کا جب اے دوستو!
ایڑیاں چلتے ہوئے اپنی اُٹھا کر کیا کروں

تُو اگر پردیس میں بیٹھے مرے بھوکا رہے
دعوتیں میں دیس کے اندر اڑا کر کیا کروں

آستیں کا سانپ کوئی جانے کب ڈس لے مجھے
ہر کسی کو میں گلے اپنے لگا کر کیا کروں

کچھ نہ حاصل ہو سکا اُسکی طلب کر کے مجھے
پھر خیال و خواب کے میلے لگا کر کیا کروں

ایک فیصد بھی رسائی کا نہیں امکان جب
پھر میں رستے کے سبھی پتھر ہٹا کر کیا کروں

جانے کب سانسوں کی ڈوری ٹوٹ جائے دوستو!
اس قدر پھر حسرتیں اپنی بڑھا کر کیا کروں

سرور فرحان

غزل

دل کی آنکھ بے قرار ہی رہے
انتظار پہ بہار ہی رہے

محبتوں کا بھی اثر نہ ہو سکا
پھول پھول، خار خار ہی رہے

دی گئی خوشی انھیں کچھ اس طرح
سوگوار، سوگوار ہی رہے

ہم ہوئے غریب سے غریب تر
مال دار، مال دار ہی رہے

ہر ادارہ چاہتا ہے باخدا
دفتروں میں لوٹ مار ہی رہے

دی گئی ہیں عزتیں بہت مگر
بے وقار، بے وقار ہی رہے

دوستوں سے ہو سکے نہ ہم شمار
دوستوں میں بے شمار ہی رہے

جو نہ تھے قطار میں، وہ لے اُڑے
ہم قطار در قطار ہی رہے

نازش! اس کو تم پہ اعتبار ہے
چاہتا ہے اعتبار ہی رہے

شبیر نازش

غزل

کوئی بھی شعر کسی کے بھی حسبِ حال نہیں
یہ کیفیات سے عاری سخن کمال نہیں

جو منتخب ہے نجانے وہ مبتذل کب ہو
کوئی خیال یہاں آخری خیال نہیں

یہ تپ نہیں کہ چڑھے اور پھر اتر جائے
مرے خمیر میں ہے شاعری، اُبال نہیں

بگاڑ بیٹھے ہیں جب زخم تو ہوا معلوم
جو اندمال سمجھتے تھے اندمال نہیں

تمام عالم و فاضل ہیں یا سبھی جاہل
کسی طرف بھی کوئی خواہشِ سوال نہیں

کسی نے زخم کو زادِ سفر کیا ہوا ہے
گرا پڑا ہے کوئی اور ذرا نڈھال نہیں

خوشی تو ہے کہ گزاری ہنسی خوشی میں ہے
ملال یہ ہے کہ نقصان کا ملال نہیں

مری رسائی مرے عکس تک نہ ہونے دے
وہ کیسا دوست ہے جو آئنہ مثال نہیں

دکھائی دیں گے بھلا زخم خاک دنیا کو
مرے وجود پہ تو نقشِ ماہ و سال نہیں

عجب ترنگ میں آئی ہوئی طبیعت ہے
زوال ہے بھی تو جاذب کوئی زوال نہیں

اکرم جاذب

غزل

وقت بدلا نہ محبت کے ستارے بدلے
عشق کے کھیل میں کب اپنے خسارے بدلے

اُس نے آنکھیں جو ذرا دیر کو پھیریں اپنی
رنگ سب رُوٹھ گئے اور نظارے بدلے

مدّتوں بعد ملے ہو تو گماں ہوتا ہے
شکل و صورت نہیں تم سارے کے سارے بدلے

موجِ دریا نے ذرا مجھ کو اُچھالا جو دیا
دیکھتے دیکھتے دریا کے کنارے بدلے

کون ہے کس نے دکھائے ہیں سہانے سپنے!
چُن لیا کس کو بتاؤ نہ ہمارے بدلے

گردشِ وقت نے چھوڑا نہ کسی بھی صورت
ہم نے سو بار مگر سوچ کے دھارے بدلے

راستہ یوں ہی نہیں چھوڑا جہاں والوں نے
زندگی ہار کے آیا ہوں تمہارے بدلے

اِک ذرا گردشِ حالات نے کیا دستک دی!
دیکھتے دیکھتے سب جان سے پیارے بدلے

پیش آئی جو زمانے کی ضرورت مجھ کو
میں نے آواز لگائی تھی کہ سارے بدلے

زندگی کس کے سہارے پہ گزاریں گے نبیلؔ
مہرباں بدلے سبھی اپنے سہارے بدلے

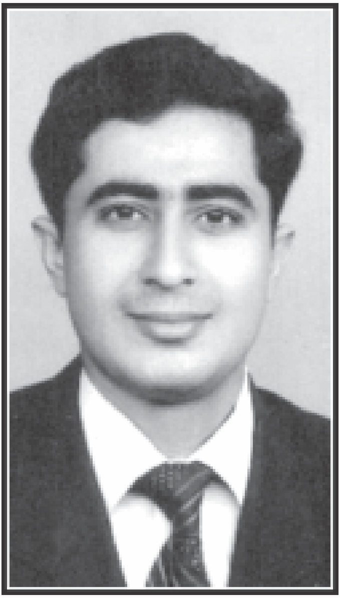

نبیل احمد نبیل

غزل

صغیر احمد صغیر

اب کسی کو بھی راس کوئی نہیں
اس پہ حد ہے اداس کوئی نہیں!

ہم نے پیڑوں سے دوستی کر لی
آدمی غم شناس کوئی نہیں

چیخ سن کر کوئی نہیں آیا
اس کا مطلب ہے پاس کوئی نہیں

جان لینا کہ مر چکے ہو تم
جب لگے دل میں آس کوئی نہیں

سوچ رکھا ہے بے لباسوں نے
اب یہاں بے لباس کوئی نہیں

میکشی کا بھرم بھی ٹوٹ گیا
پی کے بھی بدحواس کوئی نہیں

بے حسی کی یہ انتہا ہے صغیر
بے حسی پر اداس کوئی نہیں

غزل

کبھی تو ایسے کہانی میں موڑ آتے ہیں
کہ ہم زمانہ بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں

کہانی پھر بھی کہانی تھی، ختم ہونی تھی
ہمیشہ بات یہ کیوں لوگ بھول جاتے ہیں

انہیں نہ مارا تو یہ تم کو مار ڈالیں گے
چھپے جو گھاس میں یہ سانپ سرسراتے ہیں

یہیں چمکتی ہوئی بجلیاں کڑکتی ہیں
یہیں پہ پاس کہیں جھرنے گنگناتے ہیں

چرند چوکڑی بھرتے ہیں، چہلیں کرتے ہیں
پرندے دور درختوں میں غل مچاتے ہیں

قصوروار تو وہ بھی ہیں جو کہ یوں چپ چاپ
جفا و ظلم کو سہتے ہیں، غم اٹھاتے ہیں

راجہ عبدالقیوم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیا لوگ ہیں کیا ٹھانے ہیں اللہ ہی جانے
احسان بھی اپنے یہ گنانے نہیں دیتے

غزل

محبت میں یہ کیا حالت ہوئی ہے
نہ جانے موت ہے یا زندگی ہے

جنوں ہے یا فسوں ہے کیا کہیں ہم
ہر اک شے میں عیاں صورت تری ہے

خوشی ملتی ہے کم ہی زندگی میں
ملا غم تیرا اس کی بھی خوشی ہے

سمٹ کر تازگی صبح چمن کی
ترے لب کی طراوت ہوگئی ہے

کھلیں گے اس سے ہی اسرار دل کے
یہ ساغر میں جو تھوڑی سی بچی ہے

سلوک اس کا نہ پوچھو مجھ سے محسن
مسلسل دوستی میں دشمنی ہے

میتھیو محسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رات لبوں پر کیا کیا برسا ابر تری مہمانی کا
پیاس کا جھولا جھول رہا تھا ایک کٹورا پانی کا

غزل

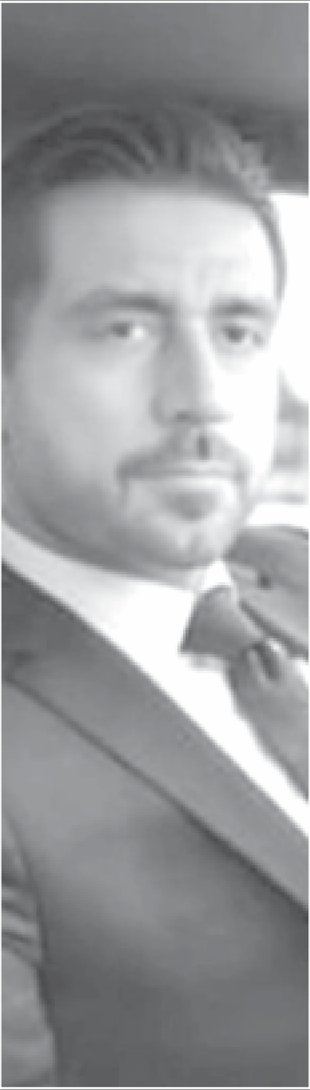

تماشا در تماشا بھی سرِ بازار ممکن ہے
کہانی میں الجھ جائے کہانی کار، ممکن ہے

سجا رکھنا ہمیشہ تم وفا کے پھول بالوں میں
کہ خوشبو کے تعاقب میں سفر دشوار ممکن ہے

وہ بازی جان کی ہو اور پھر ہنس کے لگائی ہو
محبت میں یہ ہوتا ہے، یہ میرے یار ممکن ہے

یہ ہو سکتا ہے اُس جانب کوئی ہو منتظر بیٹھا
کوئی صحرا، کوئی دریا پسِ دیوار ممکن ہے

جو اپنی ذات میں گم ہے جو تم سے کچھ نہیں کہتا
لپٹ جائے کسی دن وہ دِوانہ وار ممکن ہے

بظاہر دیکھنے میں وہ بھلے مفلس ہی لگتا ہے
مگر فن کے حوالے سے بڑا فنکار ممکن ہے

بشیر احمد محبت میں تو ایسا روز ہوتا ہے
کہ ہم خاموش بیٹھے ہیں مگر اظہار ممکن ہے

بشیر احمد حبیب

غزلیں

کیوں ہو پسینہ ماتھے پہ تلوار دیکھ کر
پڑتی ہے ٹھنڈ دل میں عزادار دیکھ کر

ہمت کہ بڑھتی جاتی ہے اپنے امیر سے
ملتا ہے چین فوج کو سالار دیکھ کر

کوئی حسین اتنا ہے، اتنا حسین ہے
بھرتا نہیں ہے جی بھی کئی بار دیکھ کر

اتنا شعورِ ذات تو ارفع ہے خیر سے
پیادہ ہیں تو حسد نہیں اسوار دیکھ کر

بڑھتی ہے جب کلائی کی طاقت لڑائی ہو
بڑھتا ہے حوصلہ کوئی دربار دیکھ کر

اتنی گھٹن ہے سینے میں بس کیا بتاؤں اب
کھڑکی کی یاد آتی ہے دیوار دیکھ کر

مسرور ہو گئے تمھیں مسرور جان کے
بیزار ہو گئے تمھیں بیزار دیکھ کر

ہر شخص کا نصیب برابر نہیں، قمر
صحرا نہ چھوڑنا گل و گلزار دیکھ کر

قمر نیاز

حسن ایسا ہے کہ تسخیر نہیں ہو سکتا
جسم اس کا کبھی تصویر نہیں ہو سکتا

پھول ہاتھوں میں ہو گلدستہ کوئی تو ہے ٹھیک
پھول ہاتھوں میں کوئی تیر نہیں ہو سکتا

تیرا سامان چھپانے کے لیے موزوں ہے
تیرا سامان تو تشہیر نہیں ہو سکتا

ہجر میں رونے کی عادت تو روا ہے ویسے
ہجر میں ماتمِ زنجیر نہیں ہو سکتا

عشق کس کو نہیں کرتا ہے بھلا اپنا مرید
پیکرِ عشق تو بے پیر نہیں ہو سکتا

غم سے رشتہ ہے اگر کوئی تو چاہت بھی ہو
کیا ہے وہ غم جو بغل گیر نہیں ہو سکتا

دل نہیں مانتا میں راہ بھی پوچھوں اس سے
قافلے والوں کا جو میر نہیں ہو سکتا

اتنا آساں نہیں الہام دوبارہ ہونا
مٹ چکا پہلے جو تحریر نہیں ہو سکتا

پاؤں پڑ کے میں اسے پھر سے منا لوں گا قمر
یار جو پاؤں کی زنجیر نہیں ہو سکتا

غزل

زندگی اپنی سُونے گھر سی ہے
شاخِ امکاں بھی بے ثمر سی ہے

کتنے لمبے ہیں مفلسی کے دن
زندگی گرچہ مختصر سی ہے

کھانے پینے میں صرف کٹتی رہے
زندگی پھر تو جانور سی ہے

غم تو پہلے ہی دشمنِ جاں تھا
اب مسرت بھی دردِ سر سی ہے

علم کی اصل جہل و نادانی
ہر خبر اب تو بے خبر سی ہے

شعلے اٹھتے ہیں جسم سے جاں سے
صورتِ عشق جلتے گھر سی ہے

اشہبِ روز و شب ہے اور ہم ہیں
زندگی اپنی اک سفر سی ہے

شیخ اقبال

غزل

ساگر حضور پوری

دل کی نہیں دماغ کی رائے سے بات کی
موقع ملا تو پھر بھی کنائے سے بات کی

نوکِ سناں پہ دھوپ کا احوال سن لیا
جب بھی کسی صلیب کے سائے سے بات کی

گاؤں میں تجھ بغیر گزارا ہے وقت یوں
گھورا کسی شجر کو، چوپائے سے بات کی

وہ ہی قدیم راگ الاپا کہ پیاس ہے
صحرازدوں نے جب بھی سرائے سے بات کی

ہندہ مزاج بھیڑ جہاں سب تھے لب سلے
ہم نے وہاں کلیجہ چبائے سے بات کی

تیرہ شبوں کے حال پہ جب طے تھی گفتگو
کیوں تم نے روشنی کے ستائے سے بات کی

ساگر مرے خلوص میں تھا نقص جن دنوں
اپنے سے بات کی نہ پرائے سے بات کی

غزل

ہم کو جنت سے جو نکالا تھا
کیا فقط ایک پھل کا جھگڑا تھا ؟

کیسے جنت میں آ گیا ابلیس ؟
آدمی کس طرح سے بہکا تھا ؟

کیوں تکبر نے اس کو آ لیا تھا؟
کیا عزازیل سب سے اعلیٰ تھا ؟

کیسے فرعون اس جگہ ڈوبا؟
پانیوں میں جہاں پہ رستہ تھا

پیاس اور کربلا کا کیا رشتہ ؟
کہتے ہیں ساتھ ہی تو دریا تھا

سارے مقتول اس کے ہوں ممنون
وہ جو مقتل میں ایک کوا تھا

مصر میں کون تھا گواہ مرا؟
ایک وہ جو پھٹا سا کرتہ تھا؟

قصہ وہ یوسف و زلیخا کا
کیا فقط عشق ہی کا قصہ تھا ؟

استعارہ تھا یا فقط کشتی ؟
نوح کا وہ جو اک سفینہ تھا

اور وہ داستان علم تھی کیا ؟
وہ جو اک خضر ، ایک موسیٰ تھا

صرف آثار ہی سے پہچانا ؟
یا خدا کو کسی نے دیکھا تھا ؟

کر رہے ہیں طواف ہم جس کا
کیا کوئی اس مکاں میں رہتا تھا ؟

اس سے پتھر اور کچھ بھی نکلا ؟
وہ جو صحرا تھا ، جس میں چشمہ تھا

کیا وہ شیطان کو لگا جا کر ؟
وہ جو کنکر سا تم نے پھینکا تھا

جان ور کون سا ہوا قربان
وہ جو اندر تھا یا خریدا تھا

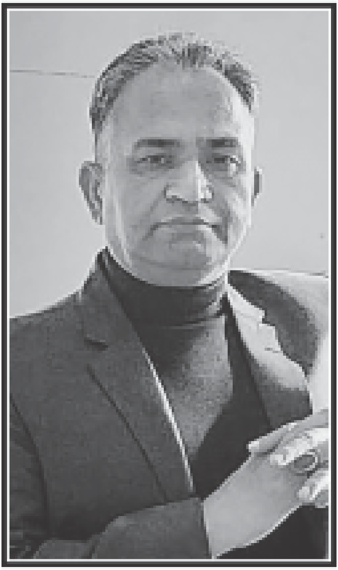

علمدار حسین

غزل

کوکی گِل

نہ چہرے پہ رونق، نہ دل میں خوشی ہے
جسے دیکھو اس کی، یہی حالت بری ہے

مصائب نے اتنا ہے سب کو ستایا
پریشاں پریشاں، ہر اک آدمی ہے

قبیلے حکومت پہ مامور سارے
روایت یہاں، ایک جیسی رہی ہے

خزاں نے اجاڑا ہوا تھا شجر کو
مگر شاخ پھر سے ہوئی اب ہری ہے

رہا راج دن بھر گھنے بادلوں کا
ہوا بھی یہاں آج ٹھنڈی چلی ہے

اداسی کہاں جان چھوڑے گی کوکی!
کہ گِل کو بھی جانے کی جلدی پڑی ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زندگی بھر یہ بوجھ ڈھونا ہے
آگہی، عمر بھر کا رونا ہے

غزل

روشنی دستیاب ہو جائے
گر دیا کامیاب ہو جائے

تیرے پاؤں پڑیں اگر اُس پر
میری مٹی گلاب ہو جائے!

میں اکیلا سفر پہ نکلا ہوں
راستہ ہم رکاب ہو جائے

تیری صورت ہے روشنی دل کی
اَب وہ آنکھوں کا خواب ہو جائے

تیرے آنے کی میں دعا مانگوں
اور دعا مستجاب ہو جائے !

آنکھ لگ جائے تیرے کہنے پر
میرا سونا ثواب ہو جائے !

اُس کے ہاتھوں کے واسطے ساجد
پھول کا انتخاب ہو جائے!!

ساجد رضا خان

غزل

سلیم اختر

دل تو ساون سے ناشناس نہیں
ہاں مگر بارشوں کی آس نہیں

کس نے چاہت کی آرزو کی ہے
کس کے حصے میں اپنی پیاس نہیں

ہیں جدائی کے مرحلے، لیکن
کیوں طبیعت مری اداس نہیں

زیر کرتی ہو جو فقیروں کو
تیرے لہجے میں وہ مٹھاس نہیں

کس قدر بدنصیب ہوتے ہیں
اپنی مٹی بھی جن کو راس نہیں

اس سے آتی نہیں ہیں خوشبوئیں
مرے کھیتوں کی یہ کپاس نہیں

اس کو ڈھونڈوں کہاں کہاں یارو
ایک دل تھا جو میرے پاس نہیں

غزل

دل ترا کاش مری یاد میں تڑپا ہوتا
ایک آنسو ہی تری آنکھ سے ٹپکا ہوتا

اب تو لگتی ہے جدائی بھی قیامت جیسے
روز شب کیسے گزرتے ہیں یہ پوچھا ہوتا

بے قراری کا سبب کیا ہے تری بتلاؤ
چند لمحے ہی مرے پاس تو ٹھہرا ہوتا

حبس اندر کا مرے بڑھتا چلا جاتا ہے
ابر چاہت کا تری مجھ پہ بھی برسا ہوتا

یوں اندھیرے مری قسمت نہ مقدر ہوتے
بن کے سورج تو مری چھت پہ جو اُترا ہوتا

اپنے دامن میں چھپا لیتا میں آنسو تیرے
سر مرے کاندھے پہ رکھ کے جو تو رویا ہوتا

محمد اشفاق بیگ

غزل

وہ جو عرشِ دعا سے اتارا گیا
اس کو دل میں بٹھا کے سنوارا گیا

میرے انکار پر دشت ایسے سجا
عرش تک پھر لہو کا اشارہ گیا

شوق میں پوچھتے ہو لٹایا ہے کیا
عشق میں یار سب کچھ ہمارا گیا

بیڑیاں کھل کے مجھ سے یہ کہنے لگیں
لے ترے ہاتھ سے یہ خسارا گیا

کشتیاں رہ گئیں دور پیچھے کہیں
ساتھ دریا کے چلتا کنارا گیا

ہم نے آیت جلانا تھا دل کا دیا
رات بھر آندھیوں کو پکارا گیا

وہ ستارا حسیں اک تری آنکھ کا
دیکھ دامن جلا کر ہمارا گیا

جب سرِ دار جلوہ ملا دید کو
چار سو پھر تو میں ہی پکارا گیا

سیدہ آیت گیلانی

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

سرِ مرقد ہیں سبھی سایہ کشا
کوئی حسرت نہیں فانی میری

غزلیں

دل گلی میں آئی ہے وہ، چاندنی کچھ اور ہے
دھوپ میں بھی چھاؤں جیسی تازگی کچھ اور ہے

چپ ہے وہ پر بولتی ہے آنکھ اُس کی رات دن
خامشی میں اس کے جیسی شاعری کچھ اور ہے

ہنس پڑی وہ، دل کے اندر پھول کھلنے لگ گئے
اس ہنسی میں جو چھپی ہے زندگی کچھ اور ہے

خواب میں جو دیکھتا تھا رنگ اس کا اور تھا
جاگتے لمحوں میں اس کی روشنی کچھ اور ہے

کھڑکیوں سے دیکھتی ہے جب وہ گم سم دوپہر
روشنی کے ساتھ اُس کی دوستی کچھ اور ہے

خود کو میں اُس کے برابر جب بھی رکھتا ہوں کبھی
دل کہے خود کو مٹا دے، عاشقی کچھ اور ہے

زین بیٹھا رہ گیا کاغذ لیے لفظوں کے بیچ
آنکھ بولی اُس جھلک کی تازگی کچھ اور ہے

عبدالرؤف زین

مری حسرتوں کا جہاں لٹ رہا تھا
محبت کا یہ گلستاں لٹ رہا تھا

کوئی غیر میری خبر کا ہے لے جب
میں اپنوں ہی کے درمیاں لٹ رہا تھا

ہے کہنے کو بچھڑا وہ اک شخص مجھ سے
مرا پر مکمل جہاں لٹ رہا تھا

کہیں فصل فٹ پاتھ پر بک رہی تھی
سرِ عام کوئی کساں لٹ رہا تھا

ہنر ور بھی فارغ ہوئے نوکری سے
مرے دیس کا ہر جواں لٹ رہا تھا

میں دل دے رہا تھا اسے زین جس دم
اسی دم مرا آشیاں لٹ رہا تھا

غزلیں

ندیم جیسا بتایا گیا بنا دیا ہے
ستم گروں نے تماشا ترا بنا دیا ہے

سنا ہے اس نے تذبذب سے جو خراب ہوا
گرانفروشوں نے اس کو کھرا بنا دیا ہے

بڑا وقار تھا اس کا گلی محلے میں
جسے رفیقوں نے مل کر ذرا بنا دیا ہے

جو ایک عرصے سے ٹوٹا ہوا تھا وحشت میں
سنا ہے رات کو اچھا بھلا بنا دیا ہے

میں چھوٹے لوگوں میں بیٹھا تو اطمینان ہوا
مجھے حریفوں نے کتنا بڑا بنا دیا ہے

گزشتہ رات تری یاد سے ہوا آباد
کہ صبح ہوتے ہی ویران سا بنا دیا ہے

بہت برے تھے زمانے میں اس لیے بھی ندیم
خدا پرستوں نے خاکہ مرا بنا دیا ہے

ندیم ملک

دفتر سے گھر، گھر سے دفتر اتنے چکر لگتے ہیں
حالت نازک ہو جاتی ہے سانس معطر لگتے ہیں

وہ جو تڑپ کر چھت سے گری تھی شکم کی آگ بجھانے کو
یہ تو اسی چڑیا کے بچے ہی کے مجھے پر لگتے ہیں

نظر کرم ہے آپ کا مجھ پر سارا عالم آپ کا ہے
اسی لیے تو اندر باہر کانچ کے پیکر لگتے ہیں

پاؤں میں پازیب کی چھن چھن دل کو سکوں پہنچاتی ہے
گھر جائیں تو دروازے بھی ہم کو خنجر لگتے ہیں

ہم کو بھی یہ علم ہے پیارے ہم نے بھی یہ بھگتا ہے
تہمت جس کے سر پر ہو تو اس کو پتھر لگتے ہیں

ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں سارے منظر پھولوں کے
ہر منظر کے عین مطابق رنگ برابر لگتے ہیں

ان کو بھی معلوم ہے سارے دن کا حال اے دوست ندیم
کہاں کہاں پر بار ہیں جمع کہاں پہ دفتر لگتے ہیں

غزل

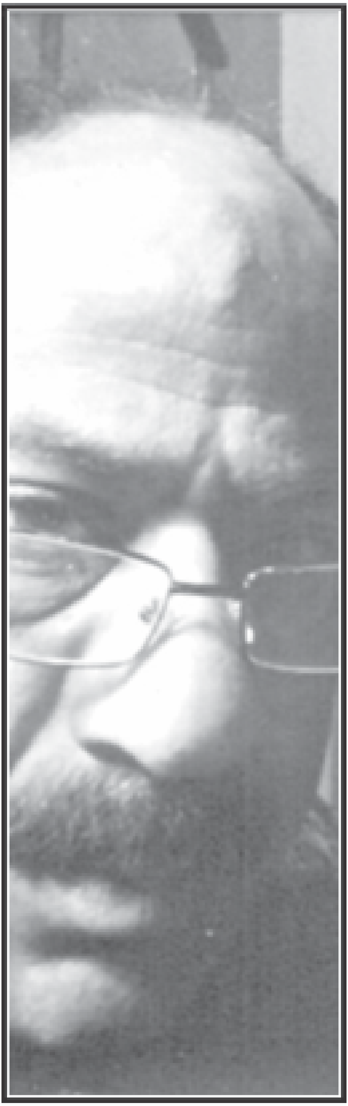

یتیم تاریخ کا چرچا ہوا ہے
مگر منہ باپ کا لٹکا ہوا ہے

ہواؤں کے علاوہ کون ہو گا
کہ دروازے پہ کچھ کھٹکا ہوا ہے

برستا رزق ہے تڑکے ہی تڑکے
مرے بچو اٹھو تڑکا ہوا ہے

اثر دیکھا ہے ہم نے نیکیوں کا
کہ پتھر غار کا سرکا ہوا ہے

مظالم اور بھی باقی ہیں لیکن
ابھی تو فلم کا وقفہ ہوا ہے

وہ سارے لکھ دیے پوچھے نہ تھے جو
بہت اچھا مرا پرچہ ہوا ہے

پرکھنا کیا بھلا قیصر کا لوگو
وہ ہم نے پہلے ہی پرکھا ہوا ہے

نبیل قیصر

غزل

دعوت شعر وسخن کس لیے گمنام کو دو
کیا ضروری ہے توجہ کوئی اس کام کو دو

زندہ لوگوں کے لیے وقت کسے ملتا ہے
کاندھا مردے کو مگر پیار سے آرام سے دو

اہم یہ بات نہیں عمر یہ گزری کیسے
کیا ضروری ہے کہ رخصت کسی الزام سے دو

کون ہے کیوں ہے مخاطب زرا واضح کر دو
دعوت ہجر ضروری ہے میرے نام سے دو

ظلم توڑا ہے فرشتوں پہ تو جھکتوگے ضرور
اب نہ دعوائے خدائی کسی پیغام سے دو

جانے والوں کو یہ ہر طور چلے جانا ہے
خیر کی ان کو دعائیں زرا دو گام سے دو

تشنہ لب اس کا چلے جانا برا لگتا ہے
وقت رخصت اسے توقیر تو اک جام سے دو

رات کا ذکر کسی طور نہ ہونے پائے
کچھ اشارا نہ حوالہ کہیں اوہام سے دو

کون کرتا ہے اشارے یہ نہ سوچو ہرگز
فاطمی درد کو الزام بھی اکرام سے دو

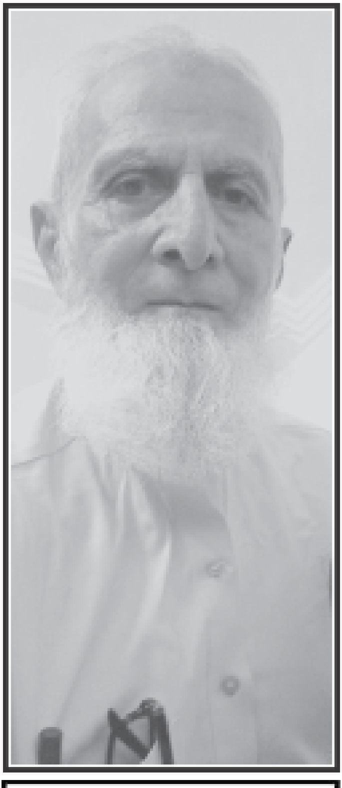

ابن عظیم فاطمی

غزل

شام ڈھلنے لگی آستانوں میں سو لو دیئے جل گئے
ورد کرتے ہوئے شاہِ جنات کے لشکری ٹل گئے

گرمیٔ رقص میں کچھ سنہری تھے کچھ آبنوسی بدن
وہ تپش تھی کہ سب نازنینوں کے ملبوس و فرغل گئے

خوش گمانی کے پاپوش پہنے ہوئے بے خطر جنگ جو
آسماں تک اڑن طشتری کی تعاقب میں پیدل گئے

کیا عجب دشت تھا ریت پر کوئی منظر ٹھہرتا نہ تھا
وقت کی آنکھ سے شہسواروں کے لشکر بھی اوجھل گئے

ریڈیائی صداؤں کی لہریں اٹھیں پہلے پاتال میں
پھر طبق در طبق سات افلاک تک سرخ سگنل گئے

زردِ شوریدگی لکھ چکی تھی عجب داستاں پیاس کی
خشک ٹیلوں پہ جب بارشوں کے لیے سبز بادل گئے

اُس طرف سے فقط ایک نوخیز اترا تھا میدان میں
اور اِدھر سے کئی دیو قامت گئے ، دیو ہیکل گئے

عابد رضا

غزل

جیا قریشی

کیوں رات ہی بس رات کی زنجیر سے ملتی
یہ روشنی ہے صبح کی تنویر سے ملتی

دشمن کو بہت اسلحہ رکھنے پہ گھمنڈ ہے
طاقت ہے ہمیں نعرۂ تکبیر سے ملتی

چالاک سمجھتے رہے محنت کا صلہ ہے
جو چیز بھی ان کو کبھی تقدیر سے ملتی

توجیہ نہیں پاس تو ہے ضعفِ بصارت
صورت ہے کہیں کی کسی رہگیر سے ملتی

مانگا ہے جیا عزّ و شرف رب سے ہمیشہ
منصب میں تو دولت نہیں توقیر سے ملتی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نظر نظر میں ہزاروں سوال ہیں لیکن
فلک سے کوئی مری سمت دیکھتا بھی تو ہو

غزل

اب ایسا دوسرا تو پڑا بھی نہیں ہوا
میں کیا کروں کہ زخم بڑا بھی نہیں ہوا

میں کس لیے بدلنے لگی اپنا راستہ
وہ شخص راستے میں کھڑا بھی نہیں ہوا

پھر بھی مصالحت نہ ہوئی اپنے درمیاں
حالانکہ کوئی ضد پہ اڑا بھی نہیں ہوا

کیونکر رگوں میں زہر کی ترسیل ہو رہی
جب نفرتوں کا ناگ لڑا بھی نہیں ہوا

وہ خواب آنسوؤں میں بھلا کیسے بہہ گیا
جو میری چشمِ تر میں گڑا بھی نہیں ہوا

پھر بھی رفاقتوں کا ثمر لگ نہیں رہا
امید کا درخت جھڑا بھی نہیں ہوا

لاؤں کہاں سے اس سے بچھڑ جانے کی دلیل
میں نے کوئی جواز گھڑا بھی نہیں ہوا

کومل جوئیہ

غزلیں

اورنگزیب حسام حر

شفا ملی تو ہوا ختم درد پانی سے
دھلی گناہ گزشتہ کی گرد پانی سے

سنا ہے جھیل کنارہ ہے مست الست ملنگ
تمام رات الجھتا ہے سرد پانی سے

وہ نرم گرم بدن روشنی مہک سر تال
رواں دواں ہے حقیقت میں فرد پانی سے

یہ کیا کہ ہونٹ کئی جم گئے ہیں شہ رگ پر
یہ کیا کہ ڈرنے لگا رہ نورد پانی سے

شمال سمت ہواؤں نے برف زاروں میں
ابھار دی ہے ہری فصل زرد پانی سے

زمیں کے ساتھ یہ کوہ و دمن ازل سے ہیں
مگر نکالے نئی راہ مرد پانی سے

وہ حر کہ لشکر باطل سے حق کی سمت آیا
ہے بے نیاز میان نبرد پانی سے

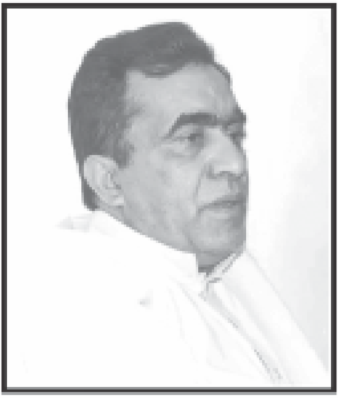

ہمارے بعد ستم آشنا ہے کون یہاں
اب اپنے آپ میں نقش ادا ہے کون یہاں
تو چشم آب کسی جھیل کا رساؤ نہیں
پھر اور اشک فشاں مبتلا ہے کون یہاں
یہ کس نے تان لگائی ہے عہد رفتہ کی
شکستہ ساز پہ نغمہ سرا ہے کون یہاں
ہمیں خبر ہے کہ ہم لوگ آخری بھی نہیں
مگر یہ ضد کہ ہمارے سوا ہے کون یہاں
سبھی کے ہاتھ ہیں پتوار سے الجھتے ہوئے
کسی کو علم نہیں ناخدا ہے کون یہاں
معاملہ ہے بہت صاف اس قضیے میں
شریک جرم کوئی دوسرا ہے کون یہاں
اسیر گنبد بے در ہوئے ہیں لوگ مگر
کسے دماغ کہ قبلہ نما ہے کون یہاں
اس اک نشان سے آگے نہیں ہے کوئی سراغ
یہ کس نے وجد میں آ کر کہا ہے کون یہاں
ہوائے دشت سے پوچھا کئے میاں مجنوں
یہاں ہے کون سوا ماسوا ہے کون یہاں

غزل

خالق آرزو

نویدِ صبح ہے ہر شام کا سورج
نکلتا ہے نئے ہنگام کا سورج

کرے جو انتہا دن کے اُجالے پر
بھلا اس کے لیے کس کام کا سورج

کسی کا بھی اجارہ تو نہیں اس پر
کہیں سب ہی اسے ہر بام کا سورج

کہ ہو جس کو عطا انعامِ قدرت
اسی کے واسطے اکرام کا سورج

جمالِ یار ہی جلوہ نما تھا
یہی ہو گا صلائے عام کا سورج

کما لے لاکھ کوئی نام دنیا میں
بلندی پر کہاں بدنام کا سورج

ابھی تو تلخیاں ہیں آرزو دل میں
ابھی ڈوبا نہیں آلام کا سورج

غزل

عاصم بخاری

کب کسی کی عزت و توقیر میں
لطف اس کو آتا ہے تحقیر میں

کرنی بھرنی کو وہ کہتا بھول کے
تھا لکھا شاید یہی ، تقدیر میں

درحقیقت اس کے ہے برعکس وہ
جتنا اچھا لگتا ہے ، تصویر میں

بیٹھتا ہے پہلی صف میں اس لیے
نظر آئے تاکہ وہ ، تصویر میں

گھر خدا کا ، یا جنازہ ، ہو کوئی
ایک آسانی رہے تشہیر میں

ہم نے دیکھا ہے سدا بازار میں
فائدے بھی ہوتے ہیں تاخیر میں

ذہن میں رکھنا سدا اس بات کو
وقت عاصم لگتا ہے ، تعمیر میں

غزل

رواں ہیں اپنی ہی رَو میں مگن آہستہ آہستہ
ستارے، چاند، میں، جگنو، ہرن آہستہ آہستہ

رہا ہو جائیں گے اک دن اچانک جسم کے قیدی
بدن کھا جائیں گے طوق و رسن آہستہ آہستہ

نہ جانے کون شے ایسی نظر آئی زمیں تجھ کو
کہ دھندلانے لگا چرخِ کہن آہستہ آہستہ

مری موجودگی تازہ رکھے گی اس کی خوشبو کو
بھلے مرجھا رہا ہے گل بدن آہستہ آہستہ

تمہارے لمس کا جادو میسر ہی نہ تھا ورنہ
اتر جاتی یہ صدیوں کی تھکن آہستہ آہستہ

بھلے تُو آج اونچائی پہ ہے، پر اے فلک زادی
دیے کے ساتھ بجھتی ہے کرن آہستہ آہستہ

انتظار سیّد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد، خلا خلا وہی سودائے آگہی
صحرا نورد راہئ افلاک ہو گئے

غزل

قطرے کا بھی مقام برابر میں آ گیا
جب دریا چل کے دور سمندر میں آ گیا

کم ظرف شخص جو نشۂ زر میں آ گیا
"دستک دیے بغیر مرے گھر میں آ گیا"

پھر عزتِ غریب سرِ عام لُٹ گئی
جب اختیار دستِ تونگر میں آ گیا

ہر دور کے یزید سے میری رہے گی جنگ
حُر کی طرح حُسین کے لشکر میں آ گیا

مہدی مجھے نصیب کہاں وصلِ خوش خرام
یہ تو رقیبِ جاں کے مقدر میں آ گیا

غضنفر مہدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک پل میں بکھرنے کو ہیں سو آئینہ خانے
روکی نہ اگر وقت کی رفتار کسی نے

غزل

تو جب ہنسے تو نغمے سناتی ہے کائنات
بلبل جو دیکھے گل کو چہکتی ہے کائنات

یہ چاندنی ہیں راتیں اور آنا ترا عجیب
لگتا ہے اک ندی میں اترتی ہے کائنات

تو نے بنائے بال تو سمجھو یہ میری جان
میں آئنہ ہوں اور سنورتی ہے کائنات

تیور یہ تیرے دیکھ کے لگتا ہے میری جان
بن بن کے کتنی بار بگڑتی ہے کائنات

تو خوش نصیب ہے جو تجھے دستیاب ہوں
میری تو اک جھلک کو ترستی ہے کائنات

دراصل میرے دل میں عجب خوف تھا شہاب
کہتے رہے یہ لوگ لرزتی ہے کائنات

شہاب اللہ شہاب

غزل

لباس بدلا، خدوخال بھی بدل ڈالے
کوئی تو ایسا ملے چال بھی بدل ڈالے

بدلتے دیکھے ہیں دن رات ہم نے خلقت کے
اگر وہ چاہے ماہ و سال بھی بدل ڈالے

کوئی نشانی مل ہم کو ڈوبے لوگوں کی
اُسی خیال میں سو جال بھی بدل ڈالے

وہی دکھاتا ہے ماضی، ہمارا مستقبل
اگر وہ دیکھے تو یہ حال بھی بدل ڈالے

کسی کی تال پہ تو بھی دھمال ڈالے گا
اُسی خیال سے قوال بھی بدل ڈالے

کوئی سمجھ ہی نہ لے میرے دل کی بے چینی
اُسی اک خوف میں سرتال بھی بدل ڈالے

اعجاز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رنگ کہتے ہیں کہانی میری
کس کی خُوشبُو تھی جوانی میری

سید فخرالدین بلّے اور ان کی غزل

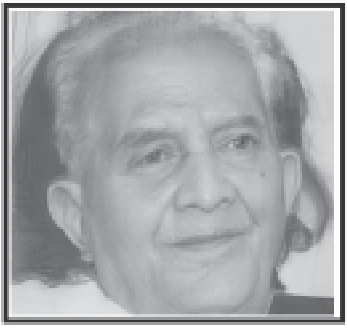

جن دنوں بلّے صاحب راولپنڈی آرٹس کونسل کے سربراہ تھے، ان سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔ ہر شام ہم چند دوست روزنامہ "نوائے وقت" کے قریب واقع داتا ریسٹوران میں بیٹھا کرتے تھے۔ باقاعدگی سے آنے والے احباب میں شفیع ضامن، یوسف حسن، نوازش علی، جہانگیر عمران اور آصف ڈار شامل تھے۔ یہاں سے آرٹس کونسل کی عمارت کا فاصلہ بمشکل ایک فرلانگ تھا۔ ہم ہفتے میں دو تین بار داتا ریسٹوران سے اٹھ کر بلّے صاحب کے ہاں چلے آتے۔ رات گئے تک نشست جاری رہتی۔ چائے بھی چلتی رہتی اور گپ شپ کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ ادب، سیاست، مذہب، کلچر گویا ہر موضوع پر گفتگو ہوتی۔ پھر بلّے صاحب کے تعاون سے حلقہ ارباب ذوق راولپنڈی کے ہفتہ وار اجلاس بھی کونسل کے دفتر ہی میں منعقد ہونے لگے۔ بلّے صاحب نہ صرف باقاعدگی سے ان میں شرکت کرتے بل کہ زیرِ بحث تخلیقات پر بھرپور اظہار خیال بھی فرماتے۔ ان کا لب ولہجہ بڑا دلپذیر ہوتا۔ ٹھہر ٹھہر کر بڑے دھیمے انداز میں بولتے اور موضوع کے حوالے سے بڑی وقیع گفتگو کرتے۔ ان کے خیالات سے ان کی علمی وسعت اور حافظے کا تاثر نمایاں ہوتا۔ کبھی کبھار مشاعروں میں ان کا کلام سننے کا موقع بھی مل جاتا۔

ایک بار ان کے ہاں کی محفل میں نہ جانے باتوں باتوں میں کیسے مذہب اور سائنس کا موضوع چھڑ گیا۔ انھوں نے فرمایا کہ اسلام اور سائنس میں تو کوئی تضاد نہیں۔ قرآن میں نہ صرف علم و تحقیق پر بہت زور دیا گیا ہے بلکہ

جلیل عالی

بعض ایسے حقائق بھی بیان ہوئے ہیں، جن تک سائنسی تحقیق کی رسائی بہت بعد میں جا کر ہوئی۔ مثلاً عورت کے پیٹ میں استقرار حمل سے لے کر بچے کی پیدائش تک کے جن مختلف مراحل کا ذکر چودہ سو سال پہلے جس صراحت کے ساتھ قرآن میں آیا ہے، ان مراحل پر حوالوں کے ساتھ بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی اور ہمیں ایک خوشگوار حیرت سے دو چار کر دیا۔ ہمارے استفسار پر انھوں نے بتایا کہ حیاتیات ان کا خاص مضمون ہے اور انھوں نے پیدائشِ انسانی کے جملہ مراحل کے حوالے سے تفصیلی مضمون بھی قلم بند کر رکھا ہے۔ انھوں نے بعد میں مجھے اس مضمون کی ایک نقل بھی عنایت فرمائی، جسے بالاستیعاب پڑھنے پر بلے صاحب کے تحقیقی کمال اور سائنسی پیش رفت سے ہزار بارہ سو برس پہلے قرآنی مندرجات کی حقانیت نے میری حیرت اور ایمانیات میں اور بھی اضافہ کر دیا۔

میری نظر سے ان کا کوئی مجموعہ کلام نہیں گزرا۔ میری معلومات کبھی کبھار منعقد ہونے والے مشاعروں میں سنے ہوئے ان کے کلام یا بعض ادبی پرچوں میں چھپی غزلوں تک محدود رہیں۔ ان کا کچھ منتخب کلام نظر سے گزرا تو مجموعی طور پر یہ تاثر بنا کہ اردو کی کلاسیکی شاعری پر ان کی گہری نظر ہے اور ان کے ہاں اپنی شعری روایت کا تخلیقی شعور نمایاں ہے۔ زیادہ مناسب الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی غزلوں میں روایت اور جدت کا خوب صورت امتزاج موجود ہے جو کہ گل و بلبل اور سطحی رومانویت کے بجائے سنجیدہ مضامین پر مشتمل ہے۔ ان کے اشعار انسان، زندگی اور کائنات کے بارے میں ان کے گہرے مشاہدے اور مطالعے کا پتہ دیتے ہیں۔

ان کے ہاں اس حقیقت کی نشاندہی بھی موجود ہے کہ بعض اوقات زندگی اور کائنات کے بارے میں مختلف فلسفے اور تصورات انسانی ذہن کو منتشر کر کے رکھ دیتے ہیں۔ انسان متباین و متضاد نظریات کی بھیڑ میں ذہنی کشمکش کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے کہ ان میں سے کس کو درست تسلیم کرے اور کس کو غلط گردانے۔ اس حوالے سے ان کا ایک شعر دیکھیے:

ہے فلسفوں کی گرد نگاہوں کے سامنے
ایسے میں خاک سوچ کو رستہ دکھائی دے

....

تاہم انھیں اس بات کا احساس ہے کہ انسانی وجود اور انسانی زندگی کی وسعتوں، گہرائیوں اور لطافتوں کا کسی عقیدے، فلسفے اور نظریے کی حدود میں سمانا محال ہے۔ یہ تنوعات، تضادات اور پیراڈاکسوں کا ایسا سلسلہ ہے کہ عقلی پیمانوں کی

محدودیت اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں:

رہیں گے قصرِ عقائد نہ فلسفوں کے محل
جو میں نے اپنی حقیقت کا انکشاف کیا

....

یہیں سے شرفِ انسانیت کا یقین ابھرتا ہے۔ ہماری فکری تہذیبی روایت میں انسان کو اشرف المخلوقات اور نائب الٰہی قرار دیا گیا ہے۔ ملے صاحب کے افکار اور خیالات پر اپنی فکری تہذیبی روایت کی گہری چھاپ صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان کے کلام میں عظمتِ انسان کے حوالے سے بہت سے اشعار موجود ہیں مثلاً:

زیرِ قدم ہے چاند، ستارے ہیں گردِ راہ
دھرتی پہ آسماں سے اترنے کے باوجود

....

حضرت علیؓ نے انسانی وجود کو کائناتِ اصغر کہا ہے۔ یوں بھی انسان کو زندگی اور کائنات میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ حضرت علی نے اسی لیے فرمایا تھا کہ جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے خدا کو پہچان لیا۔ اقبال کا یہ شعر بھی انسانی باطن کے اسی جوہر کی طرف اشارہ کرتا ہے:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

....

انسانی وجود کی اہمیت کے بعض پہلو ملے صاحب کے اشعار میں بھی اجاگر ہوئے ہیں، انسانی شخصیت کی گہرائی و گیرائی کی عکاسی کے حوالے سے ان کا یہ شعر دیکھیے:

ازل سے عالمِ موجود تک سفر کر کے
تھکے تو جسم کے حجرے میں اعتکاف کیا

....

وجودی فلسفی انسانی فکر و احساس کے حوالے سے موت کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں موت کے بارے میں انسان کا ردعمل ہی اس کے طرزِ فکر و احساس کو متعین کرتا ہے۔ تاہم دیکھا یہ گیا ہے کہ قدرت نے انسانی سرشت میں عمومی طور پر یہ بات رکھ دی ہے کہ موت کی اٹل حقیقت کے شعور کے باوجود وہ قنوطیت کا شکار نہیں ہوتا اور ہر لمحے موت کی طرف سفر کے باوجود زندگی میں اپنی تگ و دو جاری رکھتا ہے۔

غالب نے اس حوالے سے کیسا انوکھا پہلو نکالا ہے۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

....

جبکہ ایک دوسرے انداز میں کسی نے یہ کہا ہے کہ انسان رجائی رہنے پر مجبور ہے۔ ملے صاحب نے اس حقیقت کی طرف اپنے ایک شعر میں یوں اشارہ کیا ہے:

راہِ فنا پہ لوگ سدا گامزن رہے
ہر ہر نفس پہ موت سے ڈرنے کے باوجود

....

صوفیا زندگی کی بے ثباتی اور فنا کے مضمون کو انسانی تربیت کے حوالے سے بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ہماری فارسی اور اردو شاعری میں اس تصور ہی کے زیر اثر یہ مضمون بار بار بیان ہوا ہے۔ یہ دنیا دارِ فانی ہے۔ ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ مگر انسان زندگی کی دلچسپیوں میں اس اٹل حقیقت کو بھول جاتا ہے۔ جبکہ فنا اور موت کا حقیقی احساس انسان کو غرور و تکبر سے بچاتا اور اس میں عجز و انکسار پیدا کرتا ہے۔ بگّے صاحب نے ہزار بار بیان ہوئی ہوئی اس حقیقت کو اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے کہ یہ انسانی احساس کو چھو جاتی ہے۔

مٹی اڑی تو اپنی حقیقت ہوئی عیاں
جھونکا ہوا کا میرا پتہ دے گیا مجھے

....

یہ دنیا ایک میدانِ کارزار ہے۔ اس میں ازل سے خیر و شر کی کشمکش جاری ہے۔ اعلیٰ اخلاقی قدروں کی پاسداری کے ساتھ زندگی گزارنے والے مشکلات و مصائب کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ شری قوتیں ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیتی ہیں۔ ان حالات میں پامردی کے ساتھ جینے کی خاطر انسان عزم و صلاحیت اور حق پرستی کی پیکر عظیم ہستیوں سے قوت لیتا ہے۔ اس حوالے سے اسلامی، فکری، تہذیبی روایت میں واقعہ کربلا سے متعلق ہستیوں کو مثالی حیثیت حاصل ہے۔ بگّے صاحب نے اپنے جذبہ و احساس کے اظہار کے لیے اس واقعے کو جس طرح تلمیحی استعارہ بنایا ہے، اس سے ان کے تاریخی و تہذیبی شعور کا پتہ چلتا ہے۔

اٹھائے پھرتا ہوں سر اپنے تن کے نیزے پر
ہوئی ہے تنگ زمیں مجھ پہ کربلا کی طرح

....

روایت کے گہرے شعور اور تخلیقی اُپج کے کامیاب امتزاج نے بگّے صاحب کو بعض ایسے اشعار عطا کیے ہیں کہ جو نہ صرف ان کے تخلیقی جوہر کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں بلکہ حسنِ اظہار کے دلکش نمونوں کا درجہ رکھتے ہیں۔

رُتوں کی ریت یہی ہے، یہی ہوا کی روش
تپش بڑھے گی تو بادل ضرور برسے گا

اب تو مرنا بھی ہو گیا مشکل
آپ کیوں آ گئے عیادت کو

اپنی کتاب زیست پہ تنقید کے لیے
آخر میں چند سادہ ورق چھوڑ جاؤں گا

☆☆☆☆☆

اردو غزل میں تعلّی کا آغاز

تعلّی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معانی اپنی بزرگی، بڑائی یا برتری بیان کرنے کے ہیں۔ اِسے لن ترانی کے معنوں میں بھی لیا جاتا ہے۔ نچلی سطح پر یہ شیخی یا ڈینگ مارنے کے مترادف بھی سمجھی جاتی ہے۔ شاعری میں جب کوئی شاعر اپنے لیے حقیقت سے بعید دعویٰ کرتا ہے تو اسے اپنے حق میں مبالغہ آمیزی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ شعرا پر بعض اوقات ایسے تخلیقی لمحات آ جاتے ہیں جہاں اُن کی نگاہ میں فقط اپنی ہی ذات جلوہ نما ہوتی ہے اور اُن ساعتوں میں وہ اپنے ہی حوالے سے سوچ رہا ہوتے ہیں جسے کسی حد تک خود پسندی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ جب یہ عنصر بہت بڑھ جائے تو نرگسیت بھی کہلاتا ہے یعنی اپنی ذات میں اِس قدر کھو جانا کہ کسی دُوسرے کو خاطر میں نہ لایا جائے۔

اِس صنعت کی مثال اردو شاعری میں میراں میاں خان ہاشمی بیجاپوری سے قبل میری نظر سے نہیں گزری۔ ہاشمی خاصے پُرگو شاعر تھے۔ اُن کی شاعری میں تصویر کشی کا رجحان ہے۔ غزلوں میں ایہام، ریختی اور قدیم بھاشا کا رنگ ہے اور اُسی عشق مجازی کا تسلسل ہے جو غزل کی روایت ہے۔ "دیوانِ ہاشمی" کے بعض اشعار میں انھوں نے تعلّی سے کام لیا ہے اور اپنی غزل کو مصری سے بھی میٹھی قرار دیا ہے:

کہا کچھ شعر لذت ہے سنوا ے ہاشمی سچ مچ
غزل ہر یک تماری ہے مٹھی نابات بولے سو

جگت سب شعر پڑتا ہے مرا جی نچ ہوتا خوش
سو پھن ہاشمی کی سی غزل پڑھنے میں جیو خوش ہے

....

میاں نجم الدین شاہ مبارک آبرو گوالیاری کو ریختہ کا بے مثل استاد کہا جاتا ہے۔ اُردو زبان و شاعری کو آبرو جیسے سنجیدہ شعرا نے عوامی مقبولیت سے ہمکنار کرنے میں خشتِ اوّل کا کام کیا۔ وہ اُردو فارسی کے امتزاجی دور کے اوّلین شعرا میں سے ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں بدیسی ماحول پر اپنے اِرد گرد کے ماحول کو ترجیح دی۔ اپنے اثرات کے پیشِ نظر آبرو اپنے وقت

خاور اعجاز

کے ولی دکنی ہیں۔ شاید اسی کے پیشِ نظر اُنھوں نے اپنا موازنہ ولی سے کیا ہے:

آبرو شعر ہے ترا اعجاز
جو ولی کا سخن کرامت ہے

اِس کے علاوہ اُنھیں خبر تھی کہ اُن کا شعر دھوم مچا دیتا ہے جبھی تو وہ دعوت دے رہے ہیں کہ مضمون باندھنے کا دعویٰ رکھنے والے اُن سے دو دو ہاتھ کر دیکھیں:

کیوں نہ آ کر اس کے سننے کو کریں سب یار بھیڑ
آبرو یہ ریختہ تو نیں کہا ہے دھوم کا

جن کو مضمون کا دعویٰ ہے اُنھیں
آبرو سیں کہو وو بات کرو

اگر اے آبرو دیکھے ہمارے شعر کوں گوہر
تو پانی ہو کے خجلت سوں برنگِ ژالہ گل جاوے

سلک اُس کی نظم کا کیوں کر نہ ہووے قیمتی
آبرو کا شعر جو دیکھا سو مروارید ہے

....

مرزا داؤد بیگ داؤد اورنگ آبادی نے خود کو ولیِ ثانی کہہ کر صوبۂ شاعری پر اپنا حق بحال کرنے کی خواہش کی ہے:

حق نے بعد از ولی مجھے داؤد
صوبۂ شاعری بحال کیا

بعد از ولی ہوئے ہیں کئی شاعراں ولیکن
داؤد شعر تیرا مشہور ہے دکن میں

....

داؤد صرف ونحو اور عروض میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور اپنے معاصرین میں سے صرف سراج اورنگ آبادی کو اپنا مدِ مقابل تصور کرتے تھے:

جب سے روشن ہے مجہ سخن کا چراغ
رشک سیتیں سراج جلتا ہے

تعلّی نے داؤد کو بھی اپنے حلقۂ اثر میں رکھا:

سُن سخن داں تری غزل داؤد
آفریں کر خطاب کرتے ہیں

نورِ معنی ہے سخن داؤد کا روشن دلاں
ہے بجا گر اس کوں شمعِ حلقۂ مجلس کرو

ہر بیت اپنی لوحِ دل اوپر کرے گا نقش
داؤد کا یو شعر جسے تم سُناؤ گے

جو سخن فہم ہے اُسے داؤد
شعر تیرا گلے کا مالا ہے

حلاوت فہم کی مجلس میں داؤد
یو تیرا شعر شیریں جیوں شکر ہے

داؤد ترے شعر کوں سب پڑھتا ہے عالم
کیا نام ترا جگ منے مشہور ہُوا ہے

سُن کر اے داؤد تیری شاعری
ملک سب ہندوستاں کا دنگ ہے

گوش رکھ سُنتا ہے اے داؤد یار
ہر سخن تیرا درِ شہوار ہے

....

میر محمود صابر دہلوی اپنے زمانے کے مقبول شعرا میں شمار تھے اور اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز تھی۔ زبان کے معاملے میں گرچہ اُنھوں نے مروج محاورے اور تلفظ پر اکتفا کیا ہے لیکن اپنے ہمعصروں کے مقابلے میں اُن کا شعری کینوس وسیع نظر آتا ہے لیکن تعلی کے ضمن میں وہ بھی بے بس نظر آتے ہیں:

جسے مضمونِ رنگیں کا ہے دل میں شوق اے صابر
وہ آبِ زر سوں لکھتا ہے مرے اشعار ہر جانب

اہلِ عراق مست اگر ہوویں کیا عجب
گر یو غزل سناوے مغنی عراق میں

....

شیخ خادم علی خادم کیتھلی شاگرد میر تقی میر کے ہاں بھی ایک آدھ جگہ اپنی خوبی کا بیان موجود ہے:

خادم سخن تو اور بھی کہتے ہیں خوب خوب
پر ہم سے سیکھ لے کوئی طرز و ادا کی طرح

....

تاہم خود میر تقی میر کے ہاں تعلی کے مضامین سب سے زیادہ ہیں لیکن سب کے سب دعوے اُن کے منہ پر سجتے ہیں کہ اُنھیں خود بھی اپنی بڑائی کا احساس تھا:

کرتے ہیں باتیں کس کس ہنگامے کی یہ زاہد
دیوانِ حشر گویا دیوان ہے ہمارا

بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر
سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا

رہے بدحال صُوفی حال کرتے دیر مجلس میں
مغنی سے سُنا مصرع جو میرے شعرِ حالی کا

ریختہ رُتبے کو پہنچایا ہُوا اُس کا ہے
معتقد کون نہیں میر کی اُستادی کا

کسو کی بات نے آگے مرے نہ پایا رنگ
دِلوں میں نقش ہے میری سخن طرازی کا

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

سارے عالم میں ہُوں مَیں چھایا ہُوا
مستند ہے میرا فرمایا ہُوا

دفتر لکھے ہیں میر نے دِل کے الم کے یہ
یاں اپنے طور و طرز میں وہ فرد ہو گیا

ریختہ کا ہے کو تھا اِس رتبۂ اعلیٰ میں میر
جو زمیں نکلی ، اُسے تا آسماں مَیں لے گیا

اگرچہ گوشہ گزیں ہُوں میں شاعروں میں میر
پہ میرے شور نے رُوئے زمیں تمام لیا

ہے نظم کا سلیقہ ہر چند سب کو لیکن
جب جانیں کوئی لاوے یُوں موتی سے پرو کر

جو دیکھو مرے شعرِ تر کی طرف
تو مائل نہ ہو پھر گہر کی طرف

شعر ہمارے عالم کے ہر چار طرف کیا دوڑے ہیں
کِس وادی آبادی میں یہ حرف و سخن مشہور نہیں

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے، میں طبعِ رواں ہوں

مطرب سے غزل میر کی کل میں نے پڑھائی
اللہ رے اثر، سب کے تئیں رقّتی آئی

ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کریں
چاہیے اہلِ سخن میر کو استاد کریں

گر دیکھو گے تم طرزِ کلام اس کی نظر کر
اے اہلِ سخن میر کو استاد کرو گے

کھول کر دیوان میرا دیکھ قدرت مدعی
گرچہ ہوں میں نوجواں پر شاعروں کا پیر ہوں

دل اور عرش دونوں پہ گویا ہے اُن کی سیر
کرتے ہیں باتیں میر جی کس کس مقام سے

حسن تو ہے ہی، کرو لطفِ زباں بھی پیدا
میر کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے
ہماری گفتگو کا ڈھب جدا ہے

جہاں سے دیکھیے اِک شعرِ شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اِک مقام سے ہے

بات بنانا مشکل سا ہے، شعر سبھی یاں کہتے ہیں
فکرِ بلند سے یاروں کو ایک ایسی غزل کہہ لانے دو

اس فن میں کوئی بے تہ، کیا ہو مرا معارض
اوّل تو میں سند ہوں، پھر یہ مری زباں ہے

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو
مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو

نہ رکھو کان نظمِ شاعرانِ حال پر اتنے
چلو ٹک میر کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے

اشعار میر پر ہے اب ہائے وائے ہر سو
کچھ سحر تو نہیں ہے لیکن ہوا تو دیکھو

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب! صاحب نظر بنے ہے

خالی نہیں بغل کوئی دیوان سے مرے
افسانہ عشق کا ہے یہ، مشہور کیوں نہ ہو

نہ ہوئے ہم نظیری سے یوں تو
شعر کے فن میں بے نظیر ہوئے

کہے میں نے اشعار ہر بحر میں
ولیکن قیامت روانی کے ساتھ

ہو طرف مجھ پہلواں شاعر کا کب عاجز سخن
سامنے ہونے کو صاحب فن کے قدرت چاہیے

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

شمسہ نورین کی ''آبجوئے نور'' پر ایک منوّر نظر

گذشتہ دنوں ایک مشاعرے کی صدارت کرتے ہوئے اپنے آپ کو بہت ہی خوش نصیب سمجھا کہ میرے اردگرد سٹیج پر تشریف فرما نامور ہستیوں میں امریکہ سے تشریف لائی ہوئی نامور نعت گو شاعرہ نورین طلعت عروبہ، امریکہ سے واپس آئے ہوئے نعت گو اور نعت خواں نور محمد جرال، اور خطۂ پوٹھوہار کی شان شاعرہ شمسہ نورین رونق افروز تھیں جس کے تحت یہ محفل ایک نوری محفل ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔

مشاعرے کے اختتام پر جب شمسہ نورین نے اپنا تازہ نعتیہ مجموعہ ''آبجوئے نور'' عطا کیا تو پھر تو یوں لگا کہ نُورٌ علیٰ نور کا حقیقی منظر نامہ روشن ہوگیا۔ یہ کیفیت اس خوب صورت نعتیہ مجموعے کی خواندگی کے دوران میں بھی طاری رہی اور تا حال شمسہ نورین کی اس نعتیہ سرشاری کا تاثر زائل نہیں ہوا۔ خوب صورت، سادہ، اور گنجلک تراکیب سے ماورا اس مجموعے میں شمسہ نورین کی حبِ رسول کریم اردو زبان کی دل نشیں الفاظ و تراکیب میں پوٹھوہاری لہجے کی نرم روی اور مٹھاس کی ایسی کیف آفریں آمیزش لیے ہوئے ہے کہ جو دوسرے تقدیسی مجموعوں میں کم کم ہی دکھائی دیتی ہے۔

ایک سو اٹھائیس صفحات کی ضخامت پر مشتمل یہ نعتیہ مجموعہ خوب صورت سرورق کے ساتھ اور پشتِ سرورق پر مصنفہ کی تصویر کے ساتھ استاد شاعر پروفیسر ڈاکٹر احسان اکبر کے خیال افروز فلیپ کے ساتھ حال ہی میں پوٹھوہار رہتل اُسار پبلی کیشنز، راولپنڈی کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر احسان اکبر کے اس فلیپ سے ایک مختصر اقتباس ان کے طرزِ تحریر اور شمسہ نورین کی نعت گوئی کے اسلوب کا اندازہ لگانے کے لیے ملاحظہ ہو:

''جس طرح ان کی دیگر تخلیقات بناوٹ اور تکلف سے معرّیٰ ہیں اسی طرح ان کے نعتیہ کلام میں بھی زبان و بیان کی سادگی یکجان دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے

نسیم سحر

رسول اللہ کے اوصافِ حمیدہ کی ثنا گری ساری کتاب میں کی، وہ جا بجا حضوری اور کرم گستری کا سوال کرتی نظر آئیں۔ حبیب طیب، ختمِ نبوت، معراجِ نبیؐ، فضائل و درود اور ذکرِ آلِ اطہار سب کو درجہ بہ درجہ جگہ دی ہے۔ گمان ہے کہ اس اظہارِ محبت کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا"۔

ان کی کچھ عمدہ جدید ردیفیں ملاحظہ ہوں:
آپ کے دم سے، حضورؐ ہیں، ماشاء اللہ، درِ رسولؐ کی، مدینے والے، مدینے کا، کے صدقے، آپؐ کا، یا نبیؐ، سے نکلے، نہیں بھولا، مدینہ مدینہ، عطا کر، کرم ہو حضورؐ جی، رہ جائے بھرم آقاؐ، وہ کملی والاؐ، سے بڑھ کر۔

ان ردیفوں میں کچھ اشعار جنھوں نے خاص طور پر میری توجہ کھینچی:

یہ رب کو منانے کا ہنر آپؐ نے بخشا
دل میں یہ تڑپ، آنکھ میں نم، آپؐ کے دم سے

مظہر خدا کی شان کا، ذاتِ حضورؐ ہے
تخلیق کے کمال کا پیکر حضورؐ ہیں

جانے کس لمحے مدینے سے بلاوا آ جائے
رکھ لیا باندھ کے سامان، مدینے والے

یہ پنچھی دل کا چہکتا ہے اس لیے بھی بہت
بنا لیا ہے ٹھکانہ، شجر مدینے کا

جہاں یہ وباؤں کا، فتنوں کا، وحشت کدہ ہے، بجا ہے
مگر خوب اک خطۂ پُرفضا ہے، مدینہ مدینہ

آپؐ کی کالی کملی کے سائے تلے کیا عجب کیف ہے
سید الانبیاءؐ، آپؐ کا جو ہوا، بس ہوا آپؐ کا!

اُسی نے عورت کو عزتوں کی، فضیلتوں کی ردا اوڑھائی
اُسی نے حوا کی بیٹیوں کو، دیا سنبھالا، وہ کملی والا

ان کے کچھ سرشار کر دینے والے کیفیاتی اشعار جن میں سہلِ ممتنع کی چاشنی ابلاغ کی رہگذر کو روشن کر رہی ہے:

سیدھے رستے کا مفہوم اتنا سا ہے
دیکھتے جائیے بس اُنہیؐ کی طرف

ہو گیا اس کا سینہ بھی پُرنور پھر
جس کو حاصل ہوئی پنجتنی روشنی

جو بھی رستے پہ اُنؐ کے چل نکلیں
روشنی کے سفیر ہوتے ہیں

ختمِ نبوت جیسے اہم موضوع پر ان کی پوری ایک نعت ختمِ نبوت کی ردیف میں مصنفہ کے مستحکم ایمان کا اعلان کر رہی ہے:

نبیؐ کی شان ہے ختمِ نبوت
مرا ایمان ہے ختمِ نبوت

ہمارا ناز ہے نسبت نبیؐ کی
ہمارا مان ہے ختمِ نبوت

اسی طرح یہ معراجیہ شعر دیکھیے:

اُنؐ کی رفعت پہ کرتا ہے رشک آسماں
اُنؐ کو عرشِ بریں جب بُلایا گیا

وہ لمبی بحر میں بھی عمدہ نعت لکھتی ہیں، ان کی کچھ ایسی ہی نعتوں کے چند اشعار عہدِ حاضر کے آشوب کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ رسولؐ کریم کے دارِ رحمت سے رجوع کرنے کی تلقین کر رہے ہیں، یہ اشعار ان کی فنی دسترس اور عروضی گرفت کی دلالت بھی کر رہے ہیں:

ذکرِ واللیل ہے والضحیٰ ہے کہیں، جام کوثر کہیں، کالی کملی کہیں
میں نے آنکھوں سے دیکھا، پڑھا بارہا مصحفِ نور میں معجزہ نعت کا

دورِ فرعون ہے، ظلم ہے چار سُو، درد کی بیڑیاں اور سحر کاریاں
ہاں مگر یہ تسلی بہت ہے مجھے کہ مرے ہاتھ میں ہے عصا نعت کا

....

اسی تناظر میں یہ بھی دیکھیے:

اب جلد اکھڑ جائے گا در شر کے نگر کا
اے اہلِ فلسطیں، رہے خیبر کا تصور

کر خاص کرم صدقۂ حسنینِ کریمین
مولا، ہمیں آزادیٔ کشمیر عطا کر

پھر خون کے دریا میں فلسطین ہے ڈوبا
دشمن کو مٹا دے جو وہ شمشیر عطا کر

....

اپنی نعت گوئی کے حوالے سے ان کے کچھ اشعار ان پر عطائے رسولؐ کی خوب ترجمانی کر رہے ہیں:

اپنی قسمت پہ مجھے ناز بہت ہے کیونکہ
میں نے قسمت سے تری مدح سرائی پائی

ملے نعت کا قرینہ، ملے فیض کا خزینہ
چلے سلسلہ وہیں سے، ملے حرف کو سجاؤ

ملتے ہیں مضامین نئے، تازہ قرینے
بڑھتا ہے مرا زورِ قلم، آپؐ کے دم سے

اُنؐ سے خیرات حرف کی پا کر
ہم بھی نعتِ نبیؐ سنائیں گے

....

میری دعا ہے کہ شمسہ نورین کا زورِ قلم اسی تقدیسی و تخلیقی انداز میں رواں دواں رہے اور وہ رحمتِ رسولؐ کے سائبان تلے اسی طرح نئے قرینے اور نئے موضوعات پر مبنی مضامین سے کائناتِ نعت کو منور و شاداب کرتی رہیں۔ آمین

آخری بات یہ کہنا چاہوں گا کہ یہ کتاب اور اس میں شامل کئی دیباچے پڑھنے کے بعد بے اختیار جی چاہا کہ کاش شمسہ نورین اس کتاب کی اشاعت سے پہلے مجھ سے رابطہ کرتیں تو میرا دیباچہ بھی اس نوری نعتیہ مجموعے میں شامل ہوتا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ بہرحال یہ جملۂ معترضہ نہیں بل کہ ایک جملۂ تمنائیہ ہی سمجھا جائے۔ جن معروف ہستیوں کے دیباچے اور تاثرات اس نعتیہ مجموعے میں شامل ہیں اُن میں محفلِ نعت کے صدر سیّد ابرار حسین، نعت گو شاعرہ سیّدہ زینب سروری، محفلِ نعت، خواتین شاخ کی صدر پروفیسر سبین یونس، اور نعت خواں و نعت گو شاعر محمد جمیل جمیل شامل ہیں۔

☆☆☆☆☆

غلام حسین ساجد کے مجموعے ''تجاوز'' میں آئینے کا شعری اظہار

اردو شاعری میں مختلف لفظوں کا استعاراتی، علامتی اور تلمیحاتی استعمال خیال کو وسعت عطا کرنے کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ اپنے لغوی مفہوم سے قطع نظر شعری پیرائے میں لفظ خاص معنی کو اجاگر کرتا ہے تو خیال میں ندرت، وسعت، رعنائی اور رفعت پیدا ہوتی ہے۔ شاعری میں کثیر الفاظ اپنے لغوی معنی کے بجائے خاص معنوں میں جلوہ گر ہیں۔ آئینہ حیرت انگیز طور پر اردو کے تمام شعرا کا مشترکہ پسندیدہ لفظ قرار دیا جا سکتا ہے۔ میری رائے میں آئینے سے زیادہ معنوی وسعت شاید کسی دوسرے لفظ میں موجود نہیں ہے۔ کلاسیکی شاعری میں حقیقی و مجازی دائرے میں خم و پیمانہ اور ساغر و مینا سمیت میکدے کے تمام لوازمات کا شعری اظہار ملتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ غالب پہلا شاعر ہے۔ جس کی شاعری میں اس دائرے کے ساتھ ساتھ لفظ آئینہ کثرت سے موجود ہے اور اس میں معنیاتی سطح پر حد درجہ بوقلمونی ملتی ہے۔ غالب کے بعد حالی کی جدید شاعری اور اقبال کی انقلابی شاعری میں بھی آئینہ جلوہ گر ہے۔ راشد، فیض، میراجی سمیت مختلف شعرا نے بھی اس لفظ سے استفادہ کیا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد نئے شعرا نے اس لفظ کو اس کثرت سے شعری اظہار کا ذریعہ بنایا ہے کہ شاید کوئی دوسرا لفظ اس کے متقابل دکھائی نہیں دیتا ہے۔ ستر کی دہائی کے شعرا نے بھی اس لفظ کی معنیاتی جہتوں کو دریافت کیا ہے۔ ان شعرا میں ایک اہم نام غلام حسین ساجد کا ہے۔ ان کے درجن بھر شعری مجموعے شائع

شاہد اشرف

ہو چکے ہیں۔ تازہ شعری مجموعے ''تجاوز'' کا مطالعہ فکری و فنی اعتبار سے اہل نقد کی توجہ کا طالب ہے۔ مجھے اس مجموعے میں بطور خاص آئینے کے حیرت انگیز شعری اظہار نے بے حد متاثر کیا ہے ۔ وہ علامتی، استعاراتی، تشبیہی اور تلمیحاتی پیرائے میں نئے نئے خیالات سامنے لاتے ہیں۔ ان میں اکثر خیالات پہلی بار اردو شاعری کی زینت بنے ہیں۔ یہ حد درجہ کمال ہنر مندی کا اظہار غلام حسین ساجد کی فنی پختگی کا غماز ہے۔ تین ابتدائی غزلوں کے مطلعے دیکھیے:

مختلف میری بصیرت ہے نہ بینائی الگ
ہے وہی آئینہ خانہ، کار فرمائی الگ

آب آئینہ الگ ہے ، آنکھ کا پانی الگ
سادگی اپنی جگہ ہے ، حشر سامانی الگ

قیس کا قصہ الگ ہے ، میرا افسانہ الگ
آئینہ خانہ الگ ہے اور پری خانہ الگ

....

تینوں غزلوں کی بحر اور ردیف ایک ہے۔ قوافی الگ استعمال کیے گئے ہیں۔ توجہ طلب بات یہ ہے کہ تینوں مطلعوں میں آئینہ کا لفظ خاص معنی کا حامل ہے۔ پہلے شعر میں آئینہ خانہ کائنات کی غمازی کرتا ہے۔ دوسرے شعر میں آئینہ سادگی اور سچائی کا مظہر ہے۔ تیسرے شعر میں مجاز سے حقیقت کی طرف نشاندہی کرتا ہے۔ یوں تینوں اشعار الگ الگ معنیاتی جہتوں کو سامنے لاتے ہیں۔ مزید شعر ملاحظہ کیجیے:

دکھائی دیتا ہے اب آئینے میں اپنا آپ
کسی سے عشق کی توفیق دے خدا مجھ کو

....

یہاں آئینہ محض آئینہ نہیں ہے بلکہ ذات بن گیا ہے۔ جب ذات شناسی کا مرحلہ انجام پاتا ہے تو موجودات سے تعلق خاطر بڑھنے لگتا ہے۔ یوں عشق کا مرحلہ انجام پاتا ہے اور یہ صرف توفیق خدا سے ممکن ہوتا ہے۔ شاعری واقعاتی اور حسیاتی دونوں سطحوں پر شاعر کو نئے زاویے سے خیال باندھنے پر مجبور کرتی ہے ۔ ہمارے گزشتہ میں خیالات و مضامین کا لامتناہی سلسلہ موجود ہوتا ہے۔ ان سے مختلف اور جدا ہونے کی خواہش امکانات کے در وا کرتی ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

محسوس کر رہا تھا اُسے انگلیوں سے میں
تھی دھوپ آئنے کے برابر جمی ہوئی

....

دھوپ کو انگلیوں سے محسوس کرنا تو عام تجربہ قرار دیا جائے گا مگر عکس کو انگلیوں سے چھونے کا تصور اردو شاعری میں شاید پہلی بار باندھا گیا ہے۔ محسوساتی سطح پر اس شعر نے عجیب کیفیت پیدا کی ہے۔ اسے صرف وہی جان سکتا ہے۔ جو ایسے تجربے سے گزرا ہے۔ کائنات میں قبول و گریز کا عمل ازلی و ابدی سچائی کا حامل ہے۔ موجودات میں کشمکش

ہمیشہ جاری رہتی ہے مگر عکس کا آئینے سے گریز قانون فطرت سے مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ غلام حسین ساجد نے اس گریز کو یوں بیان کیا ہے:

یہ آئنہ ہے تو کیوں عکس سے گریزاں ہے
یہ باغ ہے تو یہاں خاروخس ضروری ہے

....

شعر پڑھ کر بے ساختہ سبحان اللہ کہنا پڑتا ہے۔ عکس کو آئینے کا خاروخس قرار دے کر باغ سے مشابہت پیدا کرنا کمال خیال آفرینی کا غماز ہے۔ مجھے میر درد کا ایک شعر یاد آرہا ہے:

مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمایاں
ہم آئنے کے سامنے جب آ کے ہو کریں

....

وحدت الوجود کے تناظر میں یہ شعر مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مجھے غلام حسین ساجد کا شعر اس خیال کی ایکسٹینشن دکھائی دیتا ہے۔ شعر وہی ہوتا ہے جو گزشتہ خیال میں اضافہ کر کے امکان کی صورت دکھاتا ہے۔

ایک غزل کی ردیف ”مرے آئینے میں ہے“ خاص توجہ کی متقاضی ہے۔ پہلے چند اشعار دیکھیے:

جب سے وہ چاند سی صورت مرے آئینے میں ہے
سر چھپائے ہوئے حیرت مرے آئینے میں ہے

دیکھ سکتا ہوں اندھیرے میں بھی اس گل کو میں
جب تلک شمع بصارت مرے آئینے میں ہے

اک ستم گر نے کیا ہے مجھے ساجد مخمور
ایک بھرپور قیامت مرے آئینے میں ہے

....

آئینے کو دل قرار دینا اردو شاعری کا مشترکہ تجربہ ہے اور اس بات میں ہر قدیم و جدید شاعر نے خیال باندھا ہے۔ غلام حسین ساجد نے آئینے کی ردیف کے ذریعے اس میں تنوع پیدا کیا ہے۔ مزید دیکھیے:

یہ کس کے واسطے وا ہو رہا ہے دروازہ
یہ کس خیال میں آئینہ مسکرانے لگا

راہ دکھلاتی ہے جب تک آئینے کی آب وتاب
چل رہا ہے کوئی سایہ دور تک اوڑھے ہوئے

نظر جھکائی تو آئینہ بے چراغ ہوا
زبان پھیر کے ہونٹوں پہ جگمگائے ہونٹ

ایک آئینے کو دیا تھا مجھے اذن کلام
ایک تصویر بنانا تھی ، بنائی ہی نہیں

....

ان اشعار میں آئینے کو دل قرار دے کر محبت کے نت نئے زاویے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے اور ہر زاویہ مختلف اور جدا ہے۔ سماجی ناہمواری اور سیاسی انتشار سے متعلق مضامین میں بھی آئینہ اپنی تمام آب وتاب کے سامنے معنی آفرینی دکھاتا ہے۔ بہت سے اشعار میں غلام حسین ساجد نے اس بابت واضح اشارے کیے ہیں۔ بنیادی وجہ یہ

ہے کہ ہر نئی حکومت گزشتہ حکومت سے بدتر ثابت ہوتی ہے اور ہماری زندگیوں کو مزید مشکل بنادیتی ہے۔

چراغ چھین لیے ، آئینے بدل ڈالے
سحر نے کھینچ لی مجھ پر کمان آتے ہی

....

آئینے کے ذریعے حیرانی کا تصور بھی اردو شاعری کا مشترکہ اثاثہ سمجھا جاتا ہے۔ اس باب میں بھی غلام حسین ساجد نے نئے پیکر تراشے ہیں۔ ان پیکروں کے جلوے مسحور کن اور جاذب نظر ہیں - ذات کائنات، موجودات اور عجائبات میں جابجا حیرانیاں جلوہ گر ہیں۔ جنھیں غلام حسین ساجد تصویری شکل دیتے ہیں۔

ایک حیرانی لیے ہے، ایک طغیانی لیے
آئینے کی خو الگ ہے، آب جو کی خو الگ

عکس بنتا ہے نہ میں خود ہی دھواں ہوتا ہوں
آئینہ دیکھ رہا ہے مجھے حیرانی سے

ہاتھ ملتے رہ گئے سب آئینے میری طرح
اس نے ملنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی

آئینے میں عکس حیرت کو سمانا ہی نہیں
منتظر اس کا ہوں جس کو آج آنا ہی نہیں

....

غلام حسین ساجد کی شاعری میں چراغ کا لفظ بھی خاص معنویت کا حامل ہے۔ کہیں چراغ اور آئینہ مل کر خیال کی تزئین کرتے ہیں اور یوں دو استعاروں کی یکجائی شعر کا حسن دوبالا کردیتی ہے:

پڑھتے ہی سارے شہر کی آنکھیں چلی گئیں
کیا لکھ دیا تھا آئنے پر اس چراغ نے

نہیں ہے کوئی ضرورت گریز کرنے کی
چراغ پاس ہے اور آئنہ سلامت ہے

صرف آئینہ دیکھ سکتا ہے
روشنی ہے کہاں چراغوں میں

....

یہ غلام حسین ساجد کے شعری مجموعے ''تجاوز'' میں آئینے کے اظہار کا اجمالی جائزہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی درجنوں اشعار میں آئینہ معنیاتی، حسیاتی، واقعاتی، معروضی اور موضوعی سطح پر نہایت بلیغ استعارے کی صورت میں جلوہ گر ہے۔ یہ مجموعہ مزید شعری تصورات کے جائزے کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ وہ بجا طور پر جدید اردو غزل کے نمائندہ شاعر ہیں اور ان کی یہ تازہ شعری کاوش غیر معمولی قرار دی جاسکتی ہے۔ میں مضمون کا اختتام ان کے اس شعر سے کروں گا:

تجسیم کروں عکس کو آئینے میں ساجد
مٹنے پہ اگر آئے ، مٹاتا ہوا گزروں

☆☆☆☆☆

"گمشدہ آوازوں کا تعاقب"____زویا حسن

"میں وہ شخص ہوں جو سمجھتا ہے کہ فکشن موضوع کا مسئلہ نہیں ہے، ٹریٹمنٹ کا مسئلہ ہے۔

جیسے اس کتاب میں ایک افسانہ ہے مسنگ پرسنز کے حوالے سے، تو مسنگ پرسنز کی کہانیاں تو آپ کو سوشل میڈیا پر بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔

کیا وہ سارے افسانے ہیں؟

اگر وہ سب افسانے نہیں ہیں تو یہ پھر کیوں افسانہ ہے، جو زویا حسن نے لکھا ہے۔

موضوع نے افسانہ نہیں بنایا، افسانے کی ٹریٹمنٹ نے افسانہ بنایا ہے۔

لکھنے والے کی کرافٹ کی صلاحیت نے افسانہ بنایا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ موضوع اہم ہوتا ہے مگر جو چیز فن پارے کو فن پارہ بناتی ہے وہ اس کا سٹائل ہوتا ہے، اس کا انداز ہوتا ہے۔

میں جب زویا حسن کے افسانے پڑھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ ان کے موضوعات جو حاشیے پہ زندگی گزار رہے ہیں، چھوٹی ذاتوں کے لوگوں کے بچے جو پڑھ لکھ کر اپنا کوئی مقام بنا لیتے ہیں وہ ہیں، مگر ان کے لکھنے کا انداز ساٹھ کی دہائی میں جو جدیدیت کا افسانہ سامنے آیا تھا ان جیسا ہے، اور اس کے نتیجے میں نہ وہ ساٹھ سے پہلے جو حقیقت پسندی کا افسانہ لکھا جا رہا تھا ان میں رہتی ہیں اور نہ جو ساٹھ کی دہائی کے بعد کا جو افسانہ لکھا جا رہا تھا ان میں رہتی ہیں۔ بل کہ ان دونوں کے ملاپ سے جو لہجہ اردو میں بنا ان کے جیسا ہے جس کی عمدہ اظہار ہمیں خالدہ حسین کے ہاں ملتا ہے یا خالدہ حسین کے علاوہ یہ افسانے پڑھتے جو نام میرے ذہن میں آتا ہے صغیر ملال کا ہے کہ آپ نے جملہ ایک ایسی جگہ سے شروع کرنا ہے جہاں سے عام طور پر جملہ شروع نہیں کیا جاتا اور پھر پلٹا کھاتے ہوئے بات کو مکمل کرتے ہیں۔

امجد طفیل

ایک خیال کی سیدھی لائن ہوتی ہے یعنی ایک، دو، تین، چار اور ایک ہوتا ہے کہ آپ تین سے شروع کر کے ایک، دو اور پھر چار پر آئیں تو یہ جو لکھنے کا انداز ہے وہ زویا حسن کی کہانیوں کو اکیسویں صدی میں جو افسانہ لکھنے والے آئے گزشتہ بیس پچیس سال سے، ان سب میں ان کی کہانی کو ایک الگ ذائقہ دیتے ہیں۔

دوسرا یہ بہت زیادہ تفصیلات میں نہیں جاتیں، جیسے عام طور پہ ہماری خواتین لکھنے والی ہیں، ان میں تفصیلات بہت ہوتی ہیں اس کے برعکس ہمیں زویا کے ہاں ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ کم سے کم تفصیل دیتی ہیں جس سے ایسا لگتا ہے جیسے یہ علامتی افسانہ ہے مگر یہ علامتی افسانہ ہے نہیں بل کہ یوں کہہ لیں کہ ایک تشبیہات والا انداز ہے۔

ابتدائی افسانوں پہ بات ہو چکی ہے میں آخر سے بات شروع کرتا ہوں جیسے کٹھ پتلیوں کا کھیل۔ یہ تین کرداروں کا افسانہ ہے، اور کٹھ پتلیوں سے ہمارے ذہن میں آتا ہے کہ کٹھ پتلی کیسے بنتی ہے۔

پھر سے کا بندھن ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ انسان کس طرح وقت کے فریب میں آتا ہے، جب وہ فریب ختم ہوتا ہے تو کس طرح اسے ہر چیز بے معنی نظر آتی ہے۔

اب یہاں میل کردار بھی ہیں اور فی میل کردار بھی ہیں۔

مگر بات یہ ہے کہ جب لکھنے والا خود کو صرف عورت تصور نہیں کرے گا تو پھر وہ انسانی احساسات کے بارے میں لکھے گا ایسا ہی اظہار ہمیں زویا کے ہاں ملتا ہے۔ یہ ہی نہیں کہ اس نے اپنے کرداروں کے ظاہر کے حوالے سے بات کی ہے بل کہ اس نے اپنے کرداروں کے تخیلات کو بھی گرفت میں لیا ہے۔ جیسے ایک افسانے کا ذکر بھی ہوا کہ ایک کردار ہے جو کھڑکی کے باہر ایسے کرداروں کو دیکھتی ہے جو کہ حقیقت میں نہیں ہیں امیجینیشن ہے نا اس کو تو ہم سماجی حقیقت نگاری نہیں کہہ سکتے تو زویا کے ہاں دونوں طرح کی چیزیں موجود ہیں اور بنیادی خوبی جو مجھے ان میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے اس کو الگ خانوں میں بانٹنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ایک ہی افسانے میں ساتھ ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ نیو ریلزم بھی نہیں نہ سماجی حقیقت نگاری ہے جیسے ساٹھ اور ستر کی دہائی کے بعد سامنے آیا کہ لکھنے والا یا تو کرداروں کے ظاہر پہ بات کر رہا ہے یا ان کے باطن پہ بات کر رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

عابد رضا، نئی منزلوں کا متلاشی

خدائے شب کے لیے نذر بارگاہ میں رکھ
ستارۂ سحری روزنِ سیاہ میں رکھ

فطرت نے لفظ کو بھی کیا طلسم بخشا ہے کہ سماعت اور بصارت سے گزر کر دل پذیر ہوتا جاتا ہے لیکن رکیے۔۔ ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ حواسِ سمع و بصر ان الفاظ کے عادی ہو جاتے ہیں اور دلوں پر ان کی اثر پذیری محدود یا بالکل ختم ہو جایا کرتی ہے۔

اس وقت تخلیق کار کو نئے الفاظ ڈھونڈنے یا وضع کرنے پڑتے ہیں نئے مرکبات ایجاد کرنا پڑتے ہیں روزمرہ اور محاورے کے لیے گلی محلے سے لے کر تاریخ کی راہداریوں تک کی سیاحت کرنی پڑ جاتی ہے تا کہ کانوں کے لیے رس اور آنکھوں کے لیے ٹھنڈک بہم کیے جا سکیں۔ عابد رضا ایک ایسا ہی مسافر ہے جو کانوں آنکھوں اور سوچوں تک رسائی رکھتا ہے اور ان کی تسکین کے سامان مہیا کرتا ہے۔

عابد رضا سے میری کوئی ملاقات نہیں اور ذاتی رابطہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن دیکھیے تخلیق کاروں کو قدرت نے کیا نعمت عطا کی ہے کہ وہ ملے بغیر بھی ایک دوسرے کے ہم سخن ہوتے ہیں۔ ان کے لفظ دنیا بھر میں سفر کرتے ہیں، دلوں میں اترتے ہیں اور نئے سے نئے رشتے بناتے چلے جاتے ہیں۔ عابد رضا سے میرا تعارف کچھ ایسے ہی ہوا۔ یعنی سوشل میڈیا پر اس کے کلام کی خوشبو پھیلی جس نے مجھے اسیر کیا اور ایک ورچوئل دنیا میں عابد رضا سے جا ملایا۔ پھر عابد رضا کا خوب صورت شعری مجموعہ موصول ہوا تو گویا شناسائی اور تعلق کے نئے سے نئے در کھل گئے۔ ہماری حقیقی ملاقات تو جانے کب ہو لیکن ایسا لگتا ہے کہ عابد سے میری شناسائی ازل سے ہے۔

''روزنِ سیاہ'' عابد رضا کا پہلا مجموعۂ غزلیات و منظومات ہے اور اس کی تخلیق میں اس نے وہ کاوشیں کی ہیں کہ اہلِ ذوق کا جی نہال ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نئی نسل میں بہت کم شعرا ایسے طاقتور ہوں گے جو شعر کے لگے بندھے نظام سے باہر نکل کے آزادانہ کچھ دیکھ سکیں خاص طور پر کائنات کے آغاز، مستقبل اور انجام کے بارے میں سوچنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

عابد رضا ایک ایسا ہی شاعر ہے جو بڑے سوالات اٹھاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک فنکار ہے جو معمول کی شاعری کے کینوس سے باہر بھی زقند لگاتا ہے اور غزل و نظم کے کڑے معیار کی

رحمان حفیظ

پابندی بھی کرتا ہے حقیقتاً اس نے جدّت و روایت کو نقطۂ اتصال پرلا کھڑا کیا ہے۔

نئی نسل سے گلا اپنی جگہ لیکن پرانے لکھنے والوں کی اکثریت بھی اب تک اپنے اپنے زمانوں میں ہی جی رہی ہے جب کہ اس وقت اردو دنیا میں اس شاعری کی ضرورت ہے جو تیزی سے بدلتے ہوئے دور کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہو اور مستقبل سے بھی کٹی ہوئی نہ ہو۔ اس سلسلے میں اس وقت ہماری امیدوں کا محور درجن دو درجن نوجوان شعرا ہیں جو گاہے گاہے منفرد نظمیں اور چونکا دینے والی غزلیں کہتے دکھائی دیتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا بیشتر مواد نوجوانی کی فطری تیز تخلیقی لہروں کا مرہونِ منت ہوتا ہے کچھ عرصے کے بعد وہ سب یا ان میں سے بیشتر یکسانیت کا شکار ہو جاتے ہیں اور آگے سفر کرنے والوں میں عابد رضا جیسے ہی چند شعرا ہی بچتے ہیں جو قدرت کی ودیعتی صلاحیتوں پر قناعت نہیں کر جاتے بلکہ اس آگ کو اپنی شوق کی حدت، جذبے کی شدت اور شعور کی مشاورت سے مزید دہکانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ عابد رضا کی شعری مشق ان کے ان چند اشعار سے خاص طور پر عیاں ہوتی ہے:

دن چڑھا سر پہ کفن باندھ کے تنہائی کا
اور پھر دل میں اتر آئی تری یاد کی رات

بدن کی آگ تو بجھنے کو ہے مگر اب بھی
تمام رات سلگتا ہے درد گھاؤ میں

شب سیاہ ہے اور تاک میں ہے کرگ عدم
مگر وجود کے جنگل میں خوش گماں ہوں میں

....

دو آئینے/آمنے سامنے ہوں/تو ان میں/عکس در عکس/کتنی کائناتیں سانس لیتی ہیں/یونی ورس سے/ملٹی ورس کا/ظہور کیسے ہوتا ہے/طبق در طبق ماہیت/ایک دنیا یا بہت سی دنیائیں/ایک کائنات یا بہت سی کائناتیں/ایک عالم یا بیشمار عالم/مگر میں ازل سے/ان میں صرف تم کو ڈھونڈتا ہوں/پھر بھی شاید یہ ممکن نہیں/کہ میں/دو آئینوں کے درمیان/لاتعداد کائناتوں میں/تمھارا عکس پا جاؤں،/اور پھر اسے نوچ کر علیحدہ کردوں

(ملٹی ورس اور وحدت الوجود)

اس کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ عابد رضا کا شعری اظہار بڑے قرینے سے ہوتا ہے۔ وہ شاعری کی جمالیات سے بھی خوب واقف ہے اور اس کی روایات سے بھی لیکن یہی کچھ عابد رضا کا بہترین نہیں ہے۔ دراصل اس کے اظہار کے منطقے بہت عریض و بسیط ہیں۔ وہ شاعر اور شاعری کے منصب کو اور بلند کرنا چاہتا ہے اور اس کی گواہی ''روزنِ سیاہ'' کا لفظ لفظ دیتا ہے۔ تاہم بعض جدید شعرا کی طرح وہ نئے پن کی تلاش میں لق و دق صحراؤں سے نادانی میں خاکِ بے نمو نہیں اٹھا لاتا بلکہ اس نے جدت اور ندرت کو لطافت کو ساتھ مشروط رکھا ہے۔ ہاں، ان دیکھی دنیاؤں کی سیر

اسے مرغوب بہت ہے۔ وہ وہاں سے نوادرات لاتا ہے اور اہلِ ذوق کو پیش کرتا ہے اور خاص بات یہ بھی ہے کہ اس کی منازل بہت نویکلی اور دور افتادہ ہیں:

صحیفوں میں یہی مرقوم ہے بس ہجرتِ اول سے آگے
نشیبِ خاک سے ابھرے تو اگلا معرکہ شاید سرِ افلاک ہوگا

خلا میں بھیج اڑن طشتری تحیر کی
بڑھا کے تیز قدم دشتِ بے گیاہ میں رکھ

اک اڑن طشتری کے تعاقب میں جائے گا مریخ تک
زحل کے پشت پر پھر کوئی سورما نعرہ ساماں ہے

....

عابد رضا کو یہ احساس ہے کہ قدرت نے اس کے کاندھوں پر کتنا بڑا بوجھ رکھ دیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کائنات کی بے سمت و ناہموار کھٹنائیوں میں انسان کا اشرف المخلوقات ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ بنی نوع انسان پر غور وفکر کی ذمہ داری فطرت کی ودیعت کردہ ہے اور ہمیں ہر حیثیت میں اسے پورا کرنا ہے۔ چنانچہ عابد رضا کہتا ہے:

کشتِ خلقت کی مٹی نجانے نمو گیر کیسے ہوئی
پھول کیسے کھلا، سوچنے کے لیے صرف انسان ہے

چرخ کی نیلگوں طشتری میں ستارے پگھلنے لگے
روشنی اپنے اندر سمٹتے ہوئے خود بھی حیران ہے

....

عابد رضا میں بلا کا احساسِ ذمہ داری ہے اور یہی وہ عمل ہے جو انسان کو معمولی جاندار کی سطح سے اوپر اٹھاتا ہے۔

عابد رضا اگرچہ دنیا کے جدید ترین معاشرے میں رہ کر زندگی کی جدو جہد میں مصروف ہے لیکن تخلیقی سطح پر دیکھا جائے تو اس کے کلام میں اس مٹی کی خوشبو بھی محسوس کی جاسکتی ہے جہاں اس نے جنم لیا، جس کی فضاؤں سے اس نے سانس کی تقویت لی تاکہ تخلیقی دوڑ کا حصہ بن سکے۔

اسے یہ بھی اندازہ ہے کہ تخلیقی عمل خلا میں پرورش نہیں پاتا اور اس کے لیے تخلیق کی روایت سے وابستہ رہنا از بس ضروری ہے ویسے بھی اس کی فلائٹ سولو نہیں۔ وہ ہم سب کو اپنے ساتھ لے کر چل رہا ہے۔ سماجی شراکت اس کے فکری نظام کا بنیادی حوالہ ہے اور یہی عنصر اس کے کلام کی معاشرتی افادیت کا تعین بھی کر دیتا ہے:

سلگتی تھی محلے میں نحوست کی اگر بتی
فرشتے پھر یہاں عود و سعادت کیسے بو جاتے!

یہ قضیہ لے تو جائیں آسماں پر
وہاں کچھ فیصلہ ہو جائے گا کیا؟

ہم دشتِ بلا خیز کی مٹی سے بنے تھے
عاشور کے دن سرخ ہوئی خاک ہماری

....

بستی پر شب خون پڑا تھا/ رات کو دریا خوب چڑھا تھا/ جب میں نکلا گھر سے تنہا/ اپنے دکھ کا بوجھ اٹھائے/ بقچہ باندھے/ اک روٹی/ چقماق کا پتھر/ اک مشکیزہ/ ٹوٹا خنجر/ نازک سرکنڈوں کی ناؤ/ لہروں لہروں مجھ کو لے کر/
سات سمندر پار گئی تھی/ بہہ نکلا تھا/ وقت کا دھارا/ ایک نیا گھر/ ساتھ ہمارا/ ـــ

یادوں کا پشتارہ/ جانے کتنے موسم گزرے/
پھر اک شب کو میں نے دیکھا/ ـــــ اک
دُم دار ستارہ/ صبح ہوئی تو/ کوچ رہا تھا/ ـــ ـــ
سادھو کا اکتارہ/ جادو نگری اجڑ چکی تھی/ زرد پڑا
جاتا تھا لاغر/ اجڑا بوسیدہ سیارہ/ سنتا ہوں
اب/ پاس ہی جیسے/ کوچ کا بجتا ہے نقارہ/
اڑنے کو تیار ہے شاید / ایلومینم کا
راکٹ/ ـــ ـــ پیتل کا طیارہ/ میں اپنی
تنہائی لے کر/ بقچہ باندھے/ اک روٹی/
چقماق کا پتھر/ اک مشکیزہ/ ٹوٹا خنجر/ یادوں کا
پشتارہ/ اگلی منزل دور کہیں ہے/ ـــ ـــ
کالے پتھر کا فوارہ/ اگلی ہجرت/ عالم بالا میں
اگلا سیارہ ـــ ـــ وقت کنارہ/

(اگلی ہجرت کا دکھ)

لیکن عابد رضا کی اظہار کی رفعت کا اصل مرحلہ اس سے کہیں آگے کا ہے اور وہ اس کی مستقبل بینی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس پیش بیں کلامیے کی بنیاد اگرچہ اس نے حال اور ماضی پر ہی رکھی ہے لیکن اس میں ماضی قریب کے دورانیے میں دنیا کے اندر تیزی سے آنے والی تبدیلیوں کے مطالعے سے یقینی استفادہ کیا ہے جس نے زمین کو ایک جادو نگری میں تبدیل کر دیا ہے:

چرخ کی نیلگوں طشتری میں ستارے پگھلنے لگے
روشنی اپنے اندر سمٹتے ہوئے خود بھی حیران ہے

گردوں پہ کمندیں ڈال چکے، خورشید اچھالا نیزے پر
امکان کی سرحد پار ہوئی، اب آگے کی تیاری ہے

جام جم سے انٹرنیٹ تک حیرت جب ایجاد ہوئی
سات سمندر پار کے قصے جادو ٹونے لگتے تھے

آسمانوں پہ بھی دوربینیں کئی جا بجا نصب تھیں
پر میں کیا دیکھتا کاسۂ چشم حیرت سے لبریز تھا

....

ان تبدیلیوں کا تناظر پہلے صنعتی اور پھر مصنوعی ذہانت کی غیر معمولی ترقی ہے۔ عابد رضا نے اس معاملے کو بہت گہری نظر سے دیکھا ہے اور اس پر اپنا نقطہ نظر ترتیب دیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان کو مستقبل میں زندگی گزارنے کے لیے الگ انداز اختیار کرنا ہوگا:

طلسمِ ظاہری کی سرحدوں سے شہرِ باطن کا منادی چیختا ہوگا
مسافر اب نہ ہوں غافل کہ آگے راستہ چالاک ہوگا

....

چناں چہ ایسا لگتا ہے کہ عابد رضا نے خود ٹائم مشین پر مستقبل کا سفر کیا اور واپس آ کر ہمیں وہاں کے حالات و کیفیات اور مسائل و معاملات سے آگاہ کیا۔ یہ خیال مجھے اس احساس سے آیا کہ اس کی شاعری ایک سچی آپ بیتی کی طرح محسوس ہوتی ہے اگرچہ شاعر خود اپنے آپ کو منظوم کرنے کا پابند نہیں:

ایک بے جسم ذرہ کہ شاید بنائے نئی کہکشاں
آنکھ میں روشنی کی مجرد اکائی کا فوٹان ہے

اب تو اس شہر میں بس مشینی ذہانت کی بھرمار ہے
ایک دن تھا کہ یہ مردِ آگاہ بھی فکر آمیز تھا

زمیں پہ روبوٹ اپنے آنسو کا ذائقہ تک بتا رہے ہیں
مشین زادوں پہ کیا کرامت اتر رہی ہے عجب گھڑی ہے

ہوتی ہے عطا شاہ سے روبوٹ کو خلعت
مطلوب ہیں دربار میں شاعر نہ لکھاری

....

موضوعات کی وسعت اور ہمہ گیریت کی بات کریں تو عابد رضا بہ یک وقت تاریخ و روایت، فلسفے، طبیعات، مصنوعی ذہانت اور روحانیات کے حوالے سے بات کرتا دکھائی دیتا ہے حتیٰ کہ جدید دور کی جینیٹکل انجینئرنگ اور طبی ترقی بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں۔ ان تمام علوم سے استفادے کے بعد وہ اپنا نقطہ نظر ترتیب دیتا ہے اور اس کا شاعرانہ اظہار کر دیتا ہے۔ یہاں میں حوالے کے لیے اس کی ایک اور نظم درج کرتا ہوں:

اگلے وقتوں کے اک قصہ گو پیر کہنہ نے پھر/ دشتِ بے ماجرا سے گزرتے ہوئے/ نرم رو مہرباں خضر قامت مشینی فرشتے سے/ یوں عرض کی/ اے مشیں زاد!/ اب میری پیرانہ سالی کے موسم میں/ اُن داستانوں کی چادر دریدہ ہوئی/

وہ جنھیں میں نے اپنی جوانی کے/ رنگیں تخیل کی کھڈی پہ بُن کر/ کسی نیلمیں آنکھ میں/ نذر کے واسطے رکھ دیا/ یک بہ یک میرے چاروں طرف/ وقت کی گرد ایسی اڑی/ طاقِ نسیان پر/ زرد ہوتی ہوئی/ ہر حکایت دھری کی دھری رہ گئی/ الغرض/ بھول جانے کا اک عارضہ/ جو مری جینیاتی وراثت میں لکھا گیا/ مثلِ دستِ عدو/ اب مجھے زیر کرنے کو ہے/ اے مشیں زاد!/ مدت ہوئی/ دشتِ بے ماجرا کی خموشی میں/ کہنے کو کچھ بھی نہیں/ بس یہی عرض ہے/ اس خلا کار کو/ ہفت اقلیم کے/ باہنر خوش زباں/ جینیاتی رفوگر سے جلدی ملا دے/ کہ میں اپنی بوسیدہ یادوں کی چادر مرمت کراؤں/ اور اپنے قدیمی محلے کے/ اک نیم تاریک سے قہوہ خانے میں/ پھر اگلے وقتوں کے قصے سناؤں

(ڈی میٹیا اور جینیاتی رفوگر)

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ موضوع سے انحراف کیے بغیر عابد رضا کس طرح علوم کو آپس میں منضبط کیے چلا جاتا ہے اور وہ بھی یوں کہ نہ تو غیر متعلقہ پن کا گمان ہوتا ہے اور نہ یہ عمل محض فکشن لگتا ہے۔ یہ شاعری ہے لیکن ایک منظم فکری عمل کی طرح بے جھول اور بے داغ ہے۔

مجھے مضمون کی طوالت کا احساس ہے لیکن زبان کے حوالے سے ایک دو باتیں کرنا نہایت ضروری ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ عابد رضا نے شعری لغت میں کتنا اضافہ کیا ہے لیکن آپ یہ بھی نوٹ فرمائیں کہ ان کلام ان نسبتاً اجنبی الفاظ اور بعض سائنسی اصطلاحات کے باوجود عموماً بوجھل پن کا احساس نہیں ہوتا۔ مجھے اس کی ایک ہی وجہ لگتی ہے اور وہ ہے عابد رضا کی مصرع سازی کی غیر معمولی مشق۔ بلاشبہ اس نے زبان و بیان کی سطح پر بہت کاوشوں کے بعد یہ سہولت پائی ہوگی اس کے علاوہ عابد کا صوتی ذوق بھی مجھے اعلیٰ لگا۔ وہ الفاظ کا انتخاب اور مصرعوں میں ان کی نشست کا دھیان رکھتا جاتا ہے۔

اردو دنیا کو نوید ہو کہ اسے واقعی ایک جدید شاعر میسر آ گیا ہے

☆☆☆☆☆

نوید صادق کی غزل آزما مسافت

"مسافت" جناب نوید صادق کی غزلوں کا مجموعہ ہے اور کتاب کھولنے سے پہلے اس کا جزوی حد تک اعرابی عنوان سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتا ہے کیونکہ اس میں حرف م/میم مضموم کے بجائے مفتوح لکھا گیا ہے (ممکن ہے کچھ مسافروں کی مذموم ارادوں یا حرکات کے سبب بھی اہلِ عرب نے ایسا کرنا مناسب سمجھا ہو:) بہر حال ایسا کر کے شاعر نے بہت سے قارئین کے املا و تلفظ کی اصلاح/تصحیح/درستی کرنے کی نیکی کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ عربی زبان کی خوب صورت پیچیدگیوں میں سے ایک ہے کہ مسافر میں 'م' مضموم جبکہ مسافت میں م مفتوح لکھا جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے رفیع، رفع یدین وغیرہ میں 'ر' مفتوح جبکہ رفعت میں 'ر' مکسور لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ خیر اس بابت تو استاد محترم ڈاکٹر خورشید رضوی بہترین تشریح فرما سکتے ہیں جن کے وقیع و منور کلمات سے سرورق کا عقبی صفحہ جگمگا رہا ہے۔

مسافت میں ہر قد و قامت یعنی طوالت کی غزلیں، سہ مصرعی غزلچے اور کچھ فردیات شامل ہیں۔ مجموعے کی نسبتاً طویل غزلیں اس بات کی شاہد ہیں کہ نوید صادق ہر لحاظ سے نہ صرف کُل وقتی شاعر ہیں بل کہ انھوں نے شعر و نثر کا کلاسیکی دور سے لے کر جدید شاعری تک کا مطالعہ عرق ریزی سے کرتے ہوئے زبان و بیان سے گہری دوستی بھی کر لی۔ یہی کل وقتی شاعری کی بنیادی شرط ہے ورنہ الفاظ کی بندش نگینے جڑنے کی منزل سے پیچھے رہ جاتی ہے اور شاعر کو مرصع ساز نہیں بننے دیتی۔ مجموعے کی پہلی غزل ہی سولہ اشعار پر مشتمل ہے اور ہر شعر ہر لحاظ سے بھرپور اور کسی بھی سقم سے عاری۔ اوپر سے لکھی بھی نسبتاً مشکل بحر میں ہے۔ پوری غزل تجسیم نگاری، درونِ ذات آریاں چلاتی تنہائی کا احساس، زمانے اور ماحول کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اس سے جڑت نہ ہو سکنے کی خلش اور ناموجود کی آس پاس موجودگی جیسے عناصر پر مشتمل رنگین دانوں کی عجب مالا ہے جو شاعر کو

افتخار الحق

درویشی کی طرف مائل و قائل کرتی دکھائی دیتی ہے۔ مطلع ملاحظہ کیجیے:

شکوے گلے بہت کیے شکووں گلوں نے کیا دیا
زعم جو کچھ نسب پہ تھا داؤ پہ سب لگا دیا

....

شعرا کے ہاں نام نسب کا تذکرہ سطحی انداز سے کافی ہٹ کر ہوتا ہے اور اس کی معنوی تہیں اتارنا ہی قاری کی سرشاری کا وسیلہ بنتا ہے۔ مثلاً اس بابت جب پہلی بار میں نے پروین شاکر کا یہ شعر پڑھا تو دل میں کھب سا گیا:

ہمیں بہت ہے یہ سادات عشق کی نسبت
کہ یہ قبیلہ کوئی ایسا کم نسب بھی نہیں

....

گویا نسب پر فخر کے سلسلے کا جو بیج میر کی عاشقی نے عزتِ سادات گنوانے کی صورت بویا تھا وہ قریباً تین صدیوں کا سفر کرتا جدید ترین شاعری میں نوید صادق کی شاعری تک پہنچ کر ایک بھاری بھرکم پھلدار درخت بن چکا ہے۔ انسان کا خاندانی پس منظر اس کی ذات کی شناخت کے اہم عناصر میں سے ہوتا ہے اور اس کا داؤ پہ لگنا اور کھو جانا غیر معمولی حد تک المیاتی واقعے کا درجہ رکھتا ہے۔ یوں تو اس پوری غزل کی تجزیاتی جراحت ممکن ہے لیکن اس طرح کتاب پر تبصرے کے غیر متوازن ہونے کا احتمال ہے۔ کچھ اور بے حد چونکا دینے والے اشعار دیکھیے:

میں تھا، مرے خیال میں کوئی نہیں تھا آس پاس
آخری اک چراغ تھا تو نے اسے بجھا دیا

یہ بھی نہیں کہ رات دن اپنی طرف کیا سفر
یہ بھی نہیں کہ دشت کو شہر سے لا ملا دیا

رات بھی چند ساعتیں رات سے گفتگو رہی
رات بھی چاند نے مجھے جینے کا حوصلہ دیا

دیکھ نوید ٹھیک ہے، کوئی نہیں تھا آس پاس
پھر بھی کوئی ضرور تھا، جس نے گلا دبا دیا

....

یہ اشعار اکیس ویں صدی کے انسان کی حد سے زیادہ بڑھتی ہوئی تنہائی کا نوحہ ہیں۔ ایسی شعری واردات تب ہوتی ہے جب دور دور تک ہم مزاج ہم نفس دکھائی نہ دے اور گزشتہ ادوار کے شاعر کی طرح وہاں دوش ہوتے سر کے لیے صحرا کی تلاش ہو یا پھر دیواروں سے باتیں کرنا اچھا لگنے لگے۔ ایسے اشعار صابر ظفر اور فراز کے اس اظہاری ارتقا کی اگلی منزل ہیں:

میں ایسے جمگھٹے میں کھو گیا ہوں
جہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے

اور

یہ میرے پاس کیسی روشنی ہے
کہ مجھ سے راستہ دیکھا نہ جائے

....

متذکرہ دو اشعار میں اسی داخلی کیفیت کا راست بیانیہ منظوم ہوا ہے جبکہ آج کے نوید صادق جیسے شاعر کے ہاں اس بیانیے میں خوب کس کے کچھ بل ڈال کر قاری کو اپنی قرأت کا عدسہ تبدیل کرنے پر مجبور کیا گیا ہے، یہ الگ بات کہ زیادہ سمجھدار قاری نے یہی عمل برضا و رغبت پہلے ہی کر لیا ہو۔
اگلی غزل اسی بحر میں ایک مختلف زمین پر نقش کی گئی ہے۔ اس کا یہ شعر پڑھتے ہی دل میں تراز و ہو گیا:

کیجیے ملاحظہ ذرا دفترِ ماہ و سالِ دل
میرا اسیر تھا یہ دل، اس میں پڑا ہوا تھا میں

....

ایک تو دفترِ ماہ و سال سی دلکش ترکیب اور پھر دوسرے مصرعے میں قاری کی قوتِ تفہیم کو چکرا دینے کا پورا سامان جو خود بھی بکھرا پڑا لگتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے عمیر نجمی کا ایک شاندار شعر گزرا تھا:

نکال لایا ہوں ایک پنجرے سے اک پرندہ
اب اس پرندے کے دل سے پنجرہ نکالنا ہے

....

لیکن نوید صادق کے شعر کا ایک مضمون بالکل جداگانہ ہے اور پھر اس کی بُنت میں جو معنیاتی کیفیت ہے وہ عمیر نجمی کے شعر سے کہیں مختلف ہے۔ جدید شاعری کو ایسے ہی اشعار کی ضرورت ہے اور یہی اشعار اکیسویں صدی کی غزل کے شناختی نشانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک ضمنی بات یہ کہ کچھ احباب کو عصری شعر میں تراکیب یا تو بہت پسند نہیں یا وہ اس پر فخر کرتے ہیں کہ ان کی شاعری تراکیب کی "کثافت سے پاک" ہے۔ اس نکتے سے بصد احترام اختلاف کی گنجائش ہے کیونکہ ایسی شاعری تبھی اپنی جگہ بنائے گی جب اس میں ناصر کاظمی سا اسلوب اور تاثیر بھی ہو۔ اس موضوع پر میں الگ سے ایک مضمون لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

نوید صادق کی غزلیات میں شکوہ شکایت، معاملہ بندی اور ہجر و وصال جیسے ناگزیر مضامین کا اپنا جداگانہ اور مقناطیسی کشش کا حامل رنگ ان کی شاعرانہ قامت کا تعین بھی کرتا ہے اور قاری کو اس کی پرتیں اتارنے کا چسکا بھی ڈالتا چلا جاتا ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

یاد نہ آسکوں تو بول، زنگ پڑا دریچہ کھول
تیری گلی میں کون تھا، تیرے لبوں پہ کیا تھا میں

....

یہاں شعر کا مرکزہ/نیوکلیس "زنگ پڑا دریچہ" ہے جس کے گرد باقی تمام لفظی برقیے/الیکٹران ہاتھوں میں معانی تھامے طواف کرتے نظر آتے ہیں۔ دریچے کو زنگ لازم نہیں کہ زمانی اکائیوں کی تعداد کی طرف اشارہ کن ہے بلکہ یہ اپنے بطن میں فراق کی شدت کا آئینہ دار ہے، وہ فراق جس کے اثرات مل کر تاثیر کو جدا ہونے والے شخص تک پہنچانا ہی فرضِ عین ہے۔ اس دریچے پر ہجر کی ظلمت سے لگا زنگ تبھی اُڑایا جا سکتا ہے جب ان پر کوئی خوشگوار یادوں کی قلعی کر کے نکھارے اور یہ آسانی سے کھل جائیں۔

قرطاسِ دلِ زار پہ یہ نقشِ شکستہ
وہ کون تھا جس نے مجھے دیکھا، نہیں دیکھا

....

نقشِ شکستہ کہہ کر شاعر نے ایک جہانِ طلسم پیدا کر دیا ہے اور "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" سے بات کہیں آگے لے جانے میں کامیاب ہو گیا ہے کیونکہ مومن جس کا دیدار کر رہا تھا وہ شناسائی کے کئی مدارج طے کر چکا تھا جبکہ یہاں تو "وہ کون تھا" لکھ کر قاری کے اسپِ تفہیم کے آگے ایک کھلا میدان چھوڑ دیا گیا ہے۔ ممکن ہے شاعر کو کچھ یا بہت اچھی طرح یاد ہو کہ دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھنے والا کیا تجاہلِ ناظرانہ سے کام لے رہا تھا یا اس کا منظر ہی معلوم/نامعلوم وجوہ پر بدل گیا۔

اس کوہ سے تو خیر ہمیں بھی پکارتی
یہ اور بات ہم تری آواز پر گئے

میں ذاتی طور پر "یہ" اور "وہ" قبیل کے الفاظ کو یک حرفی باندھنے اور پڑھنے کو ترجیح دیتا ہوں لیکن کامیاب شعر میں ایسی شرائط نما خواہشیں خود ہی دم توڑ دیتی ہیں جیسا کہ اس شعر میں قاری اس بات کی پذیرائی کرے کہ کوہ ندا کا نام لیے بغیر ایک تو تلمیح پوری طرح شعر میں رچا بسا دیا گیا ہے یا پھر اس جہت پر مست ہو جو دوسرے مصرعے میں ابھر آئی ہے۔ ایسے مضامین باندھنے والا شاعر دانستہ یا نادانستہ جمالیات کی طرف یوں بڑھتا ہے گویا اس کی تخلیقی وارفتگی ہی اس پر حاوی مضبوط ترین عنصر ہو۔ یہ کیفیت ان اشعار میں میرے مفروضہ نما مشاہدے کی تصدیق کے لیے کافی حد تک جھلک دکھاتی ہے:

کچھ رنگ کھلے ہیں پیرہن کے
کچھ شام کی سیر کا نشہ ہے

کچھ نقش کہ عام ہو رہے ہیں
اک رنگ کہ تیرے چار سُو ہے

کچھ تو کہیں گے ہم سے پرندے، ہوائیں، پھول
ہم نے نوائے شہر میں خیمہ لگا لیا

ایک خوشبو کہ پرکشش ہے بہت
دشتِ بے خواب میں اترتی ہے

....

رنگ، خوشبو، پھول، پیرہن وغیرہ روشن جمالیات کے دہکتے استعارے ہیں۔ یہ کسی مشاق شاعر کی راہ تک رہے ہوتے ہیں اور شاعر اس خاص لمحے کا منتظر ہوتا ہے جو کسی عمل انگیز/catalyst کے طور پر دونوں کے درمیان ایسا پُل بناتا ہے جس پر سخن وری کی ٹریفک رواں دواں ہوتی ہے اور نیچے مفہوم و معانی کا دریا جانے کتنی لہریں لیے خاموشی سے بہتا چلا جاتا ہے۔

"مسافت" میں ایک سوالیہ انداز جابجا نظر آتا ہے جو پہلے تو قدرے نامانوس لگا اور ایسا ہونا فطری سا ہے۔ پھر کچھ متن اور کچھ بین السطور زیادہ غور سے جھانکا تو جلی حروف میں تشکیک لکھا دیکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید ذہن کے لیے تشکیک وقت کے ساتھ ساتھ قوی تر ہوتا ہوا ایک عنصر اور رجحان ہے اور غالباً بڑی حد تک یہ ایک غیر رسمی سی تحریک کی صورت زیادہ نمایاں ہوتا ہوا موضوع ہے جو ایک حساس اور سخن ورانہ خلاقی کی توانائی سے معمور ذہن کے لیے بہت بڑا محرک بن جاتا ہے۔ سو کچھ بھی صورت نوید صادق کے ہاں بھی ملنا امر لازم ہی ٹھہرے گا۔ تاہم دھیان رہے کہ تشکیکی اظہاریہ تشکیل دینے کے لیے استفہامی انداز ضروری نہیں اور ہر استفہامی رنگ کے شعر کو تشکیک کے زاویے سے دیکھنا بھی گمراہ کن ہو سکتا ہے۔ یہ بنیادی اصول ذہن میں رکھتے ہوئے ان اشعار پر کچھ غور کیجیے:

مگر وہ آخری خوشبو خدا کی
کسی نے کچھ کسی نے کچھ کہا تھا

یہ ساری گفتگو مفروضہ جانو
مجھے اس روز بھی دھوکہ ہوا تھا

....

پہلا شعر تو معانی کی اتنی تہوں میں لپٹا ہوا ہے کہ کثرتِ معنی سی ترکیب اس کے آگے بونی سی لگتی ہے اور یوں تشکیک کی راہ ہموار کرتی ہے۔ خدا

کی ایسی کون سی آخری خوشبو تھی کہ جس کے جھونکے نے دنیا کو ہی مختلف الخیال کر ڈالا۔ ممکن ہے اس میں فنا فی اللہ کی کوئی راہ نکلتی ہو، ممکن ہے یہ شعر کہا ہی عالمِ جذب و مستی میں کہا گیا ہو جسے میں اکثر لمحہ یوریکا کا نام دیتا ہوں۔ یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ خدا سے مراد واقعی معبودِ واحد ہے یا کچھ اور۔ دوسرے شعر کا رنگ آفاقی ہے۔ ساری گفتگو کو کسی بھی معنی میں لینا ممکن ہے، جیسے غالب نے ایک مصرعے میں کائنات سمو دی تھی:

ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

....

پھر دوسرے مصرعے میں ''اس روز بھی دھوکہ'' ہونے کی جو معنوی لذت متن کے پار دیکھنے سے ملتی ہے اسے متن کے قالب تک محدود کرنا ناانصافی کے مترادف ہوگا۔ آپ اس شعر کے ہر مصرعے کو ہی شعر کا درجہ دے کر دیکھیں اور پھر دیکھیں تفہیم کا حق ادا کرنا کسے کہتے ہیں۔ کچھ اور اشعار اسی تناظر سے دیکھیے:

تم بھی شاید بھٹک گئے ہو
یہ اور کہیں کا راستہ ہے

میں روز کسی سے پوچھتا ہوں
میں کون تھا اور کدھر گیا ہوں

....

کتاب دیکھتے پھرتے ہیں آسمانی لوگ
کریں گے ہم پہ کوئی تازہ مہربانی لوگ

....

اس آخری شعر کے پہلے مصرعے کا اضافی حسن یہ ہے کہ ''آسمانی'' اور ''لوگ'' کے درمیان بھی وقفہ لگا کر پڑھنا ممکن ہے اور ''آسمانی لوگ'' کو بطور اکائی بھی پڑھ کر اور ہی لطف کشید کرنے پر بھی کوئی قدغن نہیں۔

آسمانوں کے اس طرف کیا ہے
تو فسانے سنانے والا کون

....

یہ شعر ہے جسے ہم آج کے ذہن کی تشکیک کا نمائندہ/prototype شعر کہہ سکتے ہیں۔ اس میں بیک وقت مذہبی طبقات کی عدم برداشت اور زیادہ تجسس کو رد کرنے کی روش، فرقہ واریت اور اس سے جنم لینے والے شاخسانے، یعنی کہ الحاد کی طرف مائل ہوتے اذہان کے سات کیسے کج احتیاطی سے نمٹنے کی فضا پروان چڑھتی ہمیں دکھائی دے رہی ہے، سبھی ممکنہ مفاہیم موجود ہیں بلکہ یہ شعر خود مخاطبی کا آئینہ دار بھی ہے کہ آج کا عقلیت پسند ذہن کافی مطالعے کے بعد جوابات کے مقابل سوالات کی زیادہ تعداد دیکھ کر بوکھلاہٹ میں خود سے ہی سوال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ اس خوبصورت غزلیاتی مجموعے کے مشتملات کو بیک وقت شاعر اور قاری کے درمیان اس طرح تقسیم کروں کہ ادب کی قانونی دستاویزات میں ملکیت شاعر کے نام ہی رہے۔ پھر کچھ استعارے ایسے ہیں جو قدیم تر دور سے اب تک شعر کیلئے مشاطگی کا کام کرتے ہیں، ان پر گفتگو نہیں کی تاکہ شاعری کا سنجیدہ قاری اتنے بیش قیمت کلام کو معمولی ساز رتعاون ادا کر کے پڑھنے کا رواج عام کرے۔ میرا اشارہ خواب، عکس اور آئینہ جیسے ابدی استعاروں کی طرف ہے۔

''مسافت'' کو شائع بھی ایک شاعرانہ ادارے نے کیا ہے: نظمیہ پبلی کیشنز لاہور۔

☆☆☆☆☆

مال کی ہوس فتنہ اور اسی فتنے کا نام ہی دنیا ہے

دنیا کی بناوٹ کو اس کے وجود کے اعتبار سے دیکھتا ہوں تو زمین پر ہوئی ساری کی ساری تخلیق قدرت کی مصوری کا پتا دیتی ہے اور خدا کو جاننے کے تناظر میں یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ خدا کا سب سے پسندیدہ مشغلہ تخلیق ہی رہا ہے اور ہر تخلیق اپنی ابتدا سے ہی اپنے حسن پر برقرار کھڑی ہے اور زمین کا سارا انتظام انسانی ضرورت کو پورا کرنے میں لگا ہوا ہے تو یہ جو پانی پہ زمین کا تخت انسان کے لیے سجایا گیا ہے اس پہ دنیا نام کی کیا حقیقت ہے جس کو اس کے بنانے والے نے بھی برائیوں فتنوں خرابیوں حقیر اور نا جانے کیا کیا ناپسندیدہ القاب سے پکارا بتایا سمجھایا ہے تبھی تو خدا کے محبوب بندوں نے دنیا کبھی دنیا بنانے والے سے بھی نہیں مانگی۔ میں بہت غور وفکر اور ذاتی زندگی کے تجربے سے جس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دنیا نام کی ساری خرابیوں کو جمع کر کے اسے کوئی نام دیا جائے تو وہ مال و دولت ہی ہوگا جس سے دنیا کے سارے فتنے رونما ہوتے ہیں ویسے تو ایمان والوں کے لیے دولت کے علاوہ بھی کئی صورتوں کو فتنے کا نام دیا گیا ہے مگر جس نے سب سے زیادہ سکون انسانی برباد کیا وہ مال ہی ہے جس کی غیر موجودگی نے اچھوں کو برا کر دکھایا اور موجودگی نے بروں کو اچھا بنا کر پیش کیا۔ اصل میں دنیا ہی ہے مال کا نام جس کی ہوس ایمان ہی کیا پورے کے پورے انسان کو ہی کھا جاتی ہے۔

جس انسان کی جائز ضرورتوں کو اس کے لیے آسان رکھ کر اسے مال کی ہوس سے آزاد کر دیا گیا اُس کی غربت بھی بادشاہی کا اک روپ ہے اور جسے ضرورتوں سے زیادہ مال دے کر مزید مال کی ہوس میں جکڑ دیا گیا اس شخص کی اپنی قیمت بھی ختم ہو جاتی ہے میں نے لاکھوں کروڑوں کے ایسے کئی

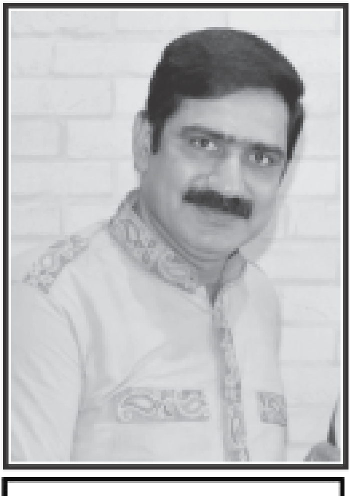

ظفر اقبال ظفر

مالک دیکھے ہیں جن کے پاس مال تو ہے مگر خود دو کوڑی کے بھی نہیں ہوتے ان بے قیمت لوگوں کو پا کر میں سوچتا تھا دنیا جتنی خودگری ہوئی ہے اس کا انتخاب خود سے زیادہ گرے ہوئے لوگ ہی ہوتے ہیں یعنی دنیا اُنہی کے پاس جاتی ہے جو دنیا کے مزاج کے ہوتے ہیں خوش قسمت ہیں وہ روحیں جنہیں دنیا راس ہی نہیں آتی اور وہ دنیاوی نظام کو ٹھکرا کر آسمانی دنیا کے دھیان میں رہتے ہیں جنہیں لوگوں نے غربت کی نفرت میں دھتکار دیا وہی لوگ آسمان والے کے لاڈلے ٹھہرے ہیں۔ دنیا کی مشکلیں صبر کرنے والوں کے لیے اگلے جہان کی آسانیاں ہیں مگر میں ایمان و انسان کے سارے رشتے کھا جانے والی دولت نامی بلا کی اتنی اہمیت کیوں بنائی پر مبنی سوال بارگاہ خداوندی میں کرتا تو جواب آتا کہ ایمان صورت حسینی میں جتنی نایاب و پاکیزہ دولت ہے اسے آزمانے کے لیے یزیدی دنیا ہی درکار تھی اپنے اردگرد کی دنیا دیکھے مال کے چکر میں ایمان کی بدصورتی کی نمائش لگا کر بیٹھی ہے دولت دنیا نے انسان کے ہاتھوں ہی انسان کو بے قیمت بنا کر رکھا دیا انسانیت کی جگہ کثرت مال دیکھ کر عزت و اہمیت دی جاتی ہے جبکہ یہ عزت و اہمیت دولت کی طرح جھوٹ کی وہ تصویر ہے جیسے مفاد کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔

کثرت زر کی ہوس میں ڈوبی بدبودار روحیں حقوق کی زمین پہ فساد کی جڑ ہیں ان کی زندگی کا واحد اصول۔ پیسہ ہو چاہے جیسا ہو۔ یہ قدرت کی طرف سے رکھا گیا حلال بھی اپنی حوس زدہ سوچ سے حرام بنا کر برکت کی توہین کے گنہگار لوگ ہیں اسلامی معاشرے کا سب سے بھیانک چہرہ اُن لوگوں کا ہے جو اسلامی حلیے میں دنیا جمع کرنے کے لیے اخلاقی شرعی قانون کی حرمت پامال کرتے ہیں مذہب کا لبادہ اُوڑھ کر شرافت کا ڈھونگ کرتے ہیں جبکہ ان کی شرافت شر اور آفت کا مجموعہ ہوتی ہے میں نے پانچ وقت کے حرام خور نمازی بھی دیکھے ہیں جو نہ نماز چھوڑتے ہیں نہ حرام چھوڑتے ہیں ان کی عبادت عبادت نہیں عادت ہے جو ان کی اندر کی حرام ہوس کو مارنے پر بے اثر رہتی ہے ان پر بات کی جائے تو یہ اپنے بدکردار کی نشاندہی کو توہین مذہب سے جوڑ کر اللہ کے بدمعاش بن جاتے ہیں دنیا کے عاشق دنیا کے حلیے میں ہی کماؤ دین کا لبادہ اُوڑھنا ہے تو دین کو کردار میں اپناؤ خریدا ہوا مال واپس اور تبدیل کرنے کے ساتھ شرعی منافع رکھو کیا یہ غرض مال دنیا کی منافقت نہیں کہ خریدتے وقت

عیب نکالیں جائیں اور وہی چیز فروخت کرتے ہوئے تعریفیں بیان کی جائیں۔ اپنی دکانوں کے باہر لوگوں کا راستہ کرایے پر دینے والوں کو اس حدیث پر ایمان کیوں نہیں کہ راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانا صدقہ ہے راستے کی جگہ پہ تو نماز تک نہیں ہوتی جب سب سے افضل عبادت جائز نہیں ہوتی تو روزی کیسے جائز ہو سکتی ہے اس عمل سے منسلک دونوں افراد حرام کا شکار ہیں طالب دنیا کے پھیلائے فتنوں پہ جتنی بھی بات کرو یہ پھیلتی ہی چلی جائے گی آپ کے اپنے ذہن میں بھی بے شمار حوالے آ رہے ہوں گے جو روزمرہ کی زندگی میں اپنے معاشرے کے طرز عمل سے سب کو نظر آتے ہیں ان ساری خرابیوں پر بات کرنے کی سمجھداری تو سبھی رکھتے ہیں مگر اصل ضرورت اس بات کی ہے جس سے اصلاح کا ایسا نظام کیسے بنایا جا سکے جس سے انسان انسان کو ہوس دنیا میں ڈسنا بند کر دیں اس کے لیے پہلے تو دنیا کی اُس نفرت کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو خدا اور خدا کے محبوب بندوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ کیا مسلمانیت کی بدقسمتی ہے کہ آسمانی معیار کی سوچ کو چھوڑ کر زمینی خرابیوں کو اصول زندگی بنا لیا جائے مصنوعی مہنگائی اور زمینی بے روزگاری کے طوفان کے آگے پل باندھنے کے بجائے اس کے نئے راستے اُس جانب کھولے جائیں جہاں مجبور بے بس انسان بستے ہیں اخلاقی قدروں کو تباہ کرنے والے حالاتوں سے سمجھوتہ کر کے اوپر کے ظلم نیچے والوں پہ تقسیم کرنے کے بجائے ظالم کو اصلاح پہ مجبور کیا جائے ریاست کی ترقی کے لیے انسانیت کے اخلاقی کردار کو مسخ کرنے والے صاحب اختیار لوگوں کی جگہ صاحب ضمیر لوگوں کو بٹھایا جائے غربت اگر اتنی ہی بری ہوتی تو خدا اپنے ہر محبوب بندے کو یہ تحفے میں نہ دیتا بدکردار دولت مندی کے بجائے باکردار غربت پہ فخر کرنا شیوہ پیغمبری ہے حلال و جائز ذرائع سے روزی کمانا عین عبادت ہے اور اس عبادت کو قضا کرنے والے کی خدائی عبادت بھی قبول نہیں ہوتی دین کے نام پر لوگوں کی آخرت کی فکر کرنے کے بجائے لوگوں کی دنیا دین کے مطابق بنانا دین سے سب سے بڑی خدمت ہے دنیاوی نظام کو دینی نظام میں ڈھالنا ہی آخرت کی تیاری ہے دنیاوی زندگی میں آسانی ہے۔ بندہ کسی بندے کا گنہگار نہ نکلا تو بخش دیا جائے گا مگر کسی بندے کا گنہگار نکلا تو ہمیشہ ہمیشہ کی ذلتوں میں جکڑ دیا جائے گا۔

☆☆☆☆☆

شعر و ادب کی شعریات

ادب کیا ہے؟

ادبی زبان کیا ہے؟

اور

ادیب کا خاصہ کیا ہے؟

مختصراً عرض کروں گا ڈاکٹر وزیر آغا نے کہیں بہت عمدہ بات لکھی کہ:

"ادب انسانی جذبات کی تہذیب کرتا ہے"

اس حوالے سے میں مزید کہنا چاہتا ہوں کہ:

ادیب کائنات کی پراسراریت کو مس کرتا ہے---

ادب کیا ہے کا آسان ترین جواب یہ بھی ہے کہ جو تخلیق/لکھت/تحریر متخیلہ کی حامل ہو گی وہ ہی ادب کے زمرے میں آئے گی۔

میتھیو آرنلڈ نے متخیلہ کو مذہب کا نعم البدل سمجھا ہے۔

جبکہ کولرج نے متخیلہ اور تخلیق کار کے ضمن میں ایک بات کی تھی میں اسے زیادہ اہم سمجھتا ہوں--- کیونکہ وہ متخیلہ کو محض تخلیق کار کی اڑان کے مترادف نہیں سمجھتا جو حقیقت سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے لیکن مشاہدات سے منسلک حسیات کو عبور کر کے باطن میں مستور روابط کو محسوس کراتی ہے۔

انسان کی ذات میں ایک جنگل آباد ہے۔

ادب، جذبات کے اس جنگل کی تقلیب کرتا ہے ادب میں داخل ہوتے ہی جذبات کے پر نکل آتے ہیں اس سے جذبات کے تشنج اور گرانباری میں کمی آتی ہے۔

لیکن اہم بات یہ ہے کہ ادب بنی بنائی لفظی تراکیب، پٹی پامال تشبیہوں اور نشان کی سطح پر رک جانے کا نام نہیں۔

ہزار بار دہرائی بتائیں اور مذہبی تڑکا لگا کر مخصوص اذہان سے کھیلنا اور جملہ سازی لطیفہ گوئی کو فروغ دینا ہرگز دائرہ ادب سے خارج ہے۔

اور اگر

شاعری پر بات ہو تو یہ سوال اہم ترین ہو گا کہ شعر کیا ہے؟

اس موضوع پر چند گزارشات عرض کرنا چاہوں گا---

سید تحسین گیلانی

شعر میں نہ صرف شاعر کی تخلیقی سطح پر اس کے حسی، جمالیاتی اور ثقافتی عناصر ایک دوسرے میں پیوستگی کے حاوی میلان کا پتا دیتے ہیں بلکہ اس کی خارجی سطح پر بھی شعر لسانی تشکیل کے عمل میں ساختگی یعنی (Structuring) کے رجحان کی غمازی کرتا ہے اصل میں یہ مختلف عناصر کی پیوستگی کا عمل ہے جو لفظوں کی ظاہری ترتیب میں صفحہء قرطاس پر نمودار ہو جاتا ہے اور قرأت کے عمل سے انار کی طرح ست رنگے پھیلاؤ میں بدل جاتا ہے۔ میں چونکہ ساختیات کا ادنیٰ طالب علم ہوں تو میں ہر ادب پارے اور شعری مجموعے کو ساختیاتی نگاہ سے دیکھتا پرکھتا ہوں جو میری مجبوری ہے لہٰذا ساختیاتی نقادوں کا کہنا ہے کہ کائنات میں چونکہ کوئی مرکزیت نہیں یا اس کے کوئی مرکزی معنی نہیں ہیں بلکہ ہر شے ایک ساختہ (سٹرکچر) ہے، جو معنی کے بجائے رشتوں کے ایک نظام پر دلالت کرتا ہے، ادب سے جو ایک کائناتی مظہر ہے کسی معین معنی کے استخراج کی توقع عبث ہے عین ہی اسی صورت حال کا اطلاق ادب اور شعر پر بھی ہوتا ہے---

اب سوال یہ ہے کہ

کیا ایک شعر ایک ہی معنی پر منتج ہو سکتا ہے؟

کیا کوئی نثر پارہ ہر قاری پر ایک معنی کے ساتھ ظہور کرتا ہے---

شاید نہیں---

اور اگر اس کا جواب ہاں ہے تو

یقیناً وہ نثر پارہ سطحی معنویت کا پروردہ ہے اور اگر معنویت پرت در پرت پیاز کے چھلکوں کی مانند لا انتہائی سلسلے سے مربوط ہے یعنی شعر یا نثر پارے نے اپنے وجود کو شعریات کے درجے پر فائز کر لیا ہے۔

لہٰذا فیصلہ قارئین شعر و ادب کو ہی کرنا ہوگا۔

لہٰذا آج کے شاعر اور نثر نگار کو خاصا محتاط ہونا ہوگا۔

چونکہ ساختیات تخلیق کی کثیرالمعنویت پر زور دیتی ہے اس لیے ساختیاتی نقاد تخلیق کار سے لہو کشید کرنے بعد اپنے وجود کا اثبات اور تحفظ کرنے اور بعد ازاں اس لہو کو چراغاں میں بدلنے کے اہتمام پر زور دیتا ہے---

بریڈلے کے نزدیک شاعری زندگی سے تعلق تو رکھتی ہے مگر بالواسطہ، اس کے خیال میں شاعری اور زندگی دو الگ الگ فنامنا phenomena ہیں اور دونوں کے "دو مختلف قسم کے وجود ہیں" ظاہر ہے زندگی سے بالواسطہ رشتے کی توثیق کر کے شعر بھی اپنے طور پر آگہی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اصلاً زندگی کے بارے میں اس فرضیت کا علم ہی آگہی پر منتج ہوتا ہے---

☆☆☆☆☆

لفظوں کی کائنات میں ایک جمالیاتی ہجرت

نجمہ منصور

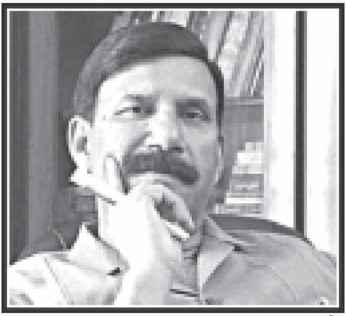

یونس خیال کا سفرنامہ ایک روایتی سیاحتی روداد نہیں بل کہ ایک جمالیاتی، فکری و تحقیقی ہجرت کی داستان ہے۔ اس سفر میں نہ صرف فاصلے طے ہوتے ہیں بل کہ زمانے، تہذیبیں، اور ذہنی کیفیات بھی بیان ہوتی ہیں۔ صفحہ در صفحہ ہم ایک ایسے مسافر کے ہمراہ چلتے ہیں جو باہر کے نظارے دیکھتے ہوئے اندر کے منظرنامے سے بھی آنکھیں چار کرتا ہے۔

"یونس خیال" کا کتاب کا ابتدائیہ صرف تعارف نہیں بل کہ مصنف کے طرزِ احساس اور طرزِ اظہار کا ایک آئینہ ہے۔ اس ابتدائیے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قلم کسی سیاح کی انگلیوں میں نہیں، ایک شاعر، ایک تخلیق کار، اور ایک شعور یافتہ انسان کے ہاتھ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کے ہر عنوان میں ایک داخلی تمثیل، ایک استعارہ، اور ایک فکری جہت پوشیدہ ہے۔

مصنف نے برطانیہ جیسے مغربی معاشرے میں قدم رکھتے ہی اپنی ثقافت، شناخت، اور احساس کو اپنے ساتھ رکھا ہے۔ وہ مہمان نوازی، ادبی محفلوں، یونیورسٹیوں، مظاہروں، اور گلیوں کی سیر کرتا ہے مگر ہر لمحے ایک باطن شناس انسان کی طرح سب کچھ اپنی معنویت میں جذب کرتا جاتا ہے۔ باب "کیا شاؤں میں سفرنامہ تجھے!" ہو یا "ایک دن ہڈرز فیلڈ یونیورسٹی میں"، "پاک برٹش آرٹس مشاعرہ" ہو یا "ناشپاتی سے سیب کے پودے تک" ہر عنوان اپنے اندر ایک تخلیقی سوال، ایک ثقافتی مشاہدہ، یا ایک انسانی جذبہ رکھتا ہے۔ یہ وہ سفر ہے جہاں لذتِ مشاہدہ، شدتِ احساس اور وسعتِ فکر ہم قدم ہو جاتے ہیں۔

اس سفرنامے میں ورڈز ورتھ کے حوالے سے باب "ایک دن ورڈز ورتھ کی رہائش گاہ پر" نے مجھے بہت دیر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ یونس خیال نے ورڈز ورتھ کی رہائش گاہ اور اس کے آس پاس کے ماحول کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ بیان کیا ہے خاص طور پر ورڈز ورتھ کے گھر کو ایک "بہت خوب صورت باغ" کے طور پر پیش کیا ہے جہاں بچپن کی یادیں بدلتے موسموں، خوشبودار پھولوں اور رنگوں سے جڑی ہوئی ہیں۔ اس باب میں 18 ویں صدی کے تاریخی باغ کی یاد دلاتے ہوئے ایک بھرپور اور سجے ہوئے منظرنامے کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جس میں "اونچے پاپلر، پھل، پھول اور مختلف قسم کے درخت" شامل ہیں، جو ایک پرسکون ماحول

پیدا کرتے ہیں۔ دریائے ڈیروینٹ سے قربت اور باغ کی دیوار سے اس کا نظارہ اس خوب صورت منظر کو مزید سحر انگیز بناتا ہے۔ اس باب میں ورڈز ورتھ کا فطرت سے گہرا تعلق اجاگر کیا گیا ہے، یہ کہتے ہوئے کہ وہ اپنا وقت ''فطرت سے الہام حاصل کرنے'' اور ''زندگی کی ابدی سچائیوں کی تصویریں بنانے'' میں صرف کرتے تھے۔ اس میں ورڈز ورتھ کو ایک ایسے شاعر کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو ''فطرت کی آواز کو پوری طرح سمجھتا تھا''، جس سے قدرتی دنیا کے ساتھ اس کا گہرا روحانی اور جذباتی تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ دریا اور پرندوں کی آوازوں کو ''موسیقی'' کے طور پر بیان کیا گیا ہے جو اس کے دل کو بھر دیتی تھی، جو فطرت میں اس کے ڈوب جانے کو مزید واضح کرتا ہے۔

مصنف نے ذکر کیا ہے کہ ورڈز ورتھ اپنی ''سادگی اور عاجزی'' کے لیے جانے جاتے تھے، جو ان کی شاعرانہ ذہانت کے باوجود ایک عاجز اور زمینی شخصیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ یونس خیال نے اس میں ورڈز ورتھ کے فن و شخصیت کا جائزہ انتہائی مثبت انداز میں لیا ہے، جو ایک ایسے شاعر کی تصویر پیش کرتا ہے جو فطرت سے گہرا تعلق رکھتا تھا، ایک خوب صورت اور متاثر کن ماحول میں رہتے ہوئے جس نے گہری اور غیر روایتی شاعری کی بہترین میراث چھوڑی۔

سفرنامہ نگار صرف نظاروں کی روداد نہیں لکھتا، وہ ظلم کے خلاف مظاہروں میں شریک ہوتا ہے، فلسطینی عوام کے حق میں آواز بلند کرتا ہے، اور ایسے افراد سے مکالمہ کرتا ہے جو برطانیہ میں ادب، مزاحمت، اور شناخت کے نمائندہ ہیں۔ اس سفر میں ادب اور احتجاج یکجا ہو جاتے ہیں۔ ایک باب میں شاعر ہے، تو دوسرے میں مظاہرین میں سے ایک آواز! ایک میں بارش ہے، تو دوسرے میں مشاعرے کی گرماہٹ۔

یونس خیال کا طرزِ نگارش نثری ہوتے ہوئے بھی شعری ہے۔ کہیں وہ تمثیل کے پردے میں بات کرتا ہے، کہیں طنز و مزاح کے پیرائے میں، اور کہیں دل سے نکلی ہوئی ایک نرم سی سانس کی صورت۔ یہ اسلوب قاری کو صرف اطلاع نہیں دیتا، بل کہ اسے شاملِ سفر کرتا ہے — ذہنی طور پر، جذباتی سطح پر اور روحانی طور پر بھی۔ ویلز کی سویلو آبشار کے کنارے سے یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

''سویلو آبشار کے پارک میں داخلے کے لیے مشین میں سکے ڈالتے ہوئے اندر آئے تو خوب صورت اونچے قدیم درختوں چہکتے پرندوں اور چھوٹی بڑی چٹانوں سے خود کو ٹکرا کر موسیقی پیدا کرتے شفاف پانیوں نے گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ آج رہنمائی کے لیے ہماری بیٹیاں زارا اور زویا بھی ساتھ تھیں اور ان دونوں کی موجودگی نے خوب صورت قدرتی ماحول کو اور بھی پرلطف بنا دیا تھا۔

سویلو آبشار شمالی ویلز کے خوب صورت ترین مقامات میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ اس خوبصورت آبشار کے ایک طرف کونے میں ایک پل اور اس کے ساتھ بیٹھنے کو ایک تختہ نما

جگہ ہے۔ ہر عمر کے سیاح یہاں تک آتے ہیں اور پھر یہاں بیٹھے خوب صورت لمحات کو کیمروں میں محفوظ کرتے ہیں۔

یہاں پر نوجوان جوڑے اپنی محبت کا پیمان باندھنے زیادہ تعداد میں آتے ہیں، اس کا اندازہ ان کے جنگلوں کے ساتھ لگائے گئے بہت سے تالے دیکھ کر ہوا۔ اس پل کے جنگلے کے ساتھ تالا لگا کر وہ اس کی چابی نیچے گزرتے آبشار کے پانی میں پھینک دیتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اب محبت کا یہ تالا کبھی کھل نہ پائے گا۔

کتنا خوب صورت احساس اور خواب ہے جسے روح کے ہاتھ سے چھوا اور کھلی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے۔ محبت شاید اسی ایک لمحے میں قید ہوتی ہے جسے آزاد کرانے میں انسان کی پوری جوانی اور پھر مٹھی میں بند رکھ کر کے محفوظ رکھنے میں بڑھاپا گزر جاتا ہے - ایک پل میں میرے سامنے نہ جانے کتنے مزاروں پر کبوتروں کو ڈالی گئی چوگیں، بوڑھے درختوں سے باندھے مختلف رنگوں کے دھاگے، سرسوں کے تیل سے جلائے گئے دیے اور چھوٹی بڑی اگر بتیوں کی خوشبوئیں تصویروں کی صورت رقص کرنے لگیں۔"

یونس خیال کا سویلو آبشار کے سفر کا یہ اقتباس محض ایک منظر کشی نہیں بل کہ فطرت، انسانی جذبات اور روحانی کیفیات کا ایک حسین امتزاج ہے۔ مصنف نے مشاہدے کی گہرائی اور الفاظ کی جادوگری سے قاری کو اس دلکش مقام کی سیر کرائی ہے، جہاں فطرت اپنے تمام حسن کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

فکری طور پر یہ اقتباس کئی پرتوں پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے، یہ فطرت سے انسان کا گہرا تعلق اجاگر کرتا ہے، جہاں آبشار کا استقبال اور قدیم درختوں، پرندوں، اور چٹانوں سے ٹکرا کر موسیقی پیدا کرتے شفاف پانیوں کا ذکر فطرت کی زندہ دلی اور اس کی مہمان نوازی کا احساس دلاتا ہے۔ "گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا" جیسی تشبیہات فطرت کو ایک جیتے جاگتے وجود کے طور پر پیش کرتی ہیں۔

دوسرا اہم فکری نقطہ انسانی رشتوں اور جذبات کی اہمیت ہے۔ بیٹیوں زارا اور زویا کی موجودگی سفر کو مزید "پُر لطف" بناتی ہے، جو اس بات کی عکاسی ہے کہ بہترین قدرتی مناظر بھی پیاروں کی سنگت کے بغیر ادھورے ہیں۔

تخلیقی لحاظ سے یہ اقتباس حسیاتی تفصیلات سے بھرپور ہے۔ مصنف نے بصری، سمعی اور حتیٰ کہ لمسی حسیات کو اس خوبی سے استعمال کیا ہے کہ قاری خود کو اس ماحول میں محسوس کرتا ہے۔ "اونچے قدیم درختوں، چہکتے پرندوں اور چھوٹی بڑی چٹانوں سے خود کو ٹکرا کر موسیقی پیدا کرتے شفاف پانیوں" جیسے الفاظ سمعی اور بصری تاثر کو گہرا کرتے ہیں۔

استعاراتی اور علامتی زبان کا استعمال بھی تخلیقی پہلو کو نکھارتا ہے۔ "محبت کا پیمان باندھنے" کے لیے پل کے جنگلے پر تالے لگانے اور چابی آبشار میں پھینک دینے کا رواج ایک خوب صورت

علامت ہے، جو محبت کے ابدی اور لازوال ہونے کی خواہش کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ عمل محض ایک رواج نہیں بل کہ ایک گہرا انسانی خواب ہے، جسے مصنف نے ”روح کے ہاتھ سے چھوا اور کھلی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے“ کہہ کر ایک ماورائی جہت دی ہے۔

اقتباس کا اختتام تصورات اور احساسات کے باہمی رقص پر ہوتا ہے، جہاں مصنف اچانک اپنے سامنے ”مزاروں پر کبوتروں کو ڈالی گئی چوگیں، بوڑھے درختوں سے باندھے مختلف رنگوں کے دھاگے، سرسوں کے تیل سے جلائے گئے دیے اور چھوٹی بڑی اگربتیوں کی خوشبوئیں“ کو تصویروں کی صورت رقص کرتے دیکھتا ہے۔ یہ حصہ مصنف کی تخلیقی پرواز کو ظاہر کرتا ہے، جہاں ایک خاص منظر (سوملیو آبشار) سے ذہن ماضی کے دوسرے مقامات اور ان سے وابستہ انسانی عقائد اور امیدوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی فکری وسعت ہے جو سادہ مشاہدے کو روحانی اور فلسفیانہ گہرائی بخشتی ہے۔

کتاب کا آخری باب ”تکمیل ہے، ابھی سفر باقی ہے“ بذات خود ایک فکری اعلان ہے کہ ہر اختتام ایک نیا آغاز ہے۔ یہی وہ روح ہے جو اس سفرنامے کو عام روداودں سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ سفر ختم نہیں ہوتا، بلکہ قاری کے دل میں اتر کر جاری رہتا ہے۔ یہ سفرنامہ نہ صرف اردو ادب میں ایک وقیع اضافہ ہے بل کہ اردو سفرنامہ نگاری کی نئی جہتوں کا مظہر بھی ہے۔ یہ کتاب طالب علموں، ادب دوستوں اور محققین سب کے لیے ایک خزینہ ہے۔ ایک ایسا آئینہ جو صرف باہر نہیں، اندر بھی دکھاتا ہے۔

یہ سفرنامہ صرف زمینوں کا مشاہدہ نہیں بلکہ دلوں رویوں معاشروں اور تہذیبوں کا سفر بھی ہے یہ محض جغرافیائی نقل و حرکت کی داد نہیں بلکہ ایک فکری اور تخلیقی جست ہے۔ اس سفرنامے میں قاری کو بین السطور ایک ایسا مشاہدہ ملتا ہے جو داخلی و خارجی دونوں سطحوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

یونس خیال نے اس میں اپنے تخلیقی مزاج مشاہداتی عمیق نظری اور ادب کے ساتھ قلبی وابستگی کا مظاہرہ کیا ہے یہ سفرنامہ بتاتا ہے کہ یہ محض مشاہدات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک حسی اور فکری تجربہ ہے جس میں یادیں، تاریخی شعور اور عصری آگہی باہم جڑے ہوئے ہیں۔

یونس خیال کا یہ سفرنامہ درحقیقت ”خیال“ کا سفر ہے اور خیال کا سفر کبھی رکتا نہیں۔ خود ان کا کہنا ہے کہ:

”کائنات میں زندگی کا سفر ابھی جاری ہے۔ جب تک یہ جاری ہے دوست احباب سفرنامے لکھتے رہیں گے اور اپنی کہانیوں اور خواہشات کو مختلف عنوانات کے روپ میں ڈھالتے رہیں گے ---- میں بھی انہی کا ایک حصہ ہوں۔

کیا سناؤں میں سفرنامہ تجھے
نامکمل ہے ابھی میرا سفر“

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر نثار ترابی...... علم و محبت کی تصویرِ مجسّم

بعض لوگ اس مٹی پر ایسے اُترتے ہیں جیسے صبح کی کرنیں اُترتی ہیں خامشی سے، لیکن سارے منظر کو روشن کر دینے والی۔ ڈاکٹر نثار ترابی کا شمار انھی ہستیوں میں ہوتا ہے جو نہ صرف علم و ادب کا حوالہ ہیں، بل کہ اخلاق محبت اور انسان دوستی کا زندہ استعارہ بھی۔

جب میں ساتویں جماعت کا ایک سادہ سا طالب علم تھا، تب پہلی بار ڈاکٹر نثار ترابی کے اشعار میری دنیا میں داخل ہوئے۔ ایک عجیب سی روشنی تھی اُن اشعار میں نہ صرف لفظوں کی چمک، بل کہ احساس کی تپش۔ یہی وہ لمحہ تھا جس دل نے انھیں پہچانا اور چپکے سے ان کی محبت کا اسیر ہو گیا وقت گزرتا گیا، اور اللہ کے کرم اور ڈاکٹر صاحب کی شفقت سے وہ دن بھی آیا کہ میں اُن کے ساتھ ایک ہی مشاعرے میں شریک ہوا۔ اُس لمحے میری نظر میں فن اور زندگی کا فاصلہ ختم ہو گیا۔ وہ جو میں نے کتابوں میں پڑھا تھا، اب میرے پہلو میں بیٹھا مسکرا رہا تھا، سراہ رہا تھا۔

ڈاکٹر نثار ترابی صرف شاعر نہیں، وہ الفاظ کے زاہد اور احساسات کے درویش ہیں۔

محمود الحسن محمود

اُن کا کلام علم و عشق کا امتزاج ہے۔ وہ روایت سے جُڑے ہوئے ہیں، مگر اُن کے ہاں جدید حسیت بھی پوری شدت سے موجود ہے۔ اُن کی شاعری میں فکر کی تازگی بھی ہے اور دل کی سچائی بھی۔ ان کیا شعار میں گہری بصیرت، تہذیبی شعور، اور ایک مہذب سماجی احتجاج جھلکتا ہے۔ ان کے ہاں محبت صرف رومان نہیں، بل کہ ایک روحانی کیفیت کا نام ہے۔

ڈاکٹر نثار ترابی ابن نایاب انسانوں میں سے ہیں، جو شاگردوں کو صرف علم نہیں دیتے،ان کی زندگی سنوارتے ہیں۔ کئی ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبہ دہ وہ رہنما ہیں، لیکن ان کی رہنمائی محض علمی نہیں، اخلاقی اور روحانی بھی ہے۔ ان کی تربیت میں شفقت کی شیرینی ،علم کی گہرائی اور محبت کی روشنی شامل ہوتی ہے۔ وہ ہر چھوٹے کو وہی عزت دیتے ہیں جو بڑے کو دی جاتی ہے۔ وہ خود ستائش کے قحط زدہ دور میں دوستوں کو عزت بخشنے والا چراغ ہیں۔ اُن کی مجلس میں بیٹھنا صرف ادبی تجربہ نہیں، بل کہ انانی تربیت کا ایک خاموش درس ہے۔ پاکستان کے مشاعروں سے لے کر بین الاقوامی مشاعروں تک، جہاں بھی ڈاکٹر نثار ترابی گئے، وہاں اردو کی عزت بڑھی، شعر کی توقیر میں اضافہ ہوا، اور سننے والوں کے دلوں میں محبت جاگی۔ وہ اس زمین سے محبت کرتے ہیں، اور ان کے اشعار میں دھرتی کی وشبو بولتی ہے۔ میرے لیے ڈاکٹر صاحب صرف ایک ادیب یا شاعر نہیں نسبت ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھیں دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ علم اگر محبت کے ساتھ جُو جائے، تو شخصیت میں روشنی پیدا ہوتی ہے۔ میری پی ایچ ڈی کی راہ بھی انھی کے حوصلے سے ہموار ہوئی۔ وہ میرے علمی سفر کے چراغ بردار بھی ہیں، اور میری ذات کے خیمے میں روشنی کرنے والے بھی۔ ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں جو اپنی موجودگی سے دلوں کو جیتتے ہیں، اور اپنے اشعار سے نسلوں کو شعور دیتے ہیں۔ ڈاکٹر نثار ترابی اُن میں سے ایک ہیں محبت کی تہذیب کا چراغ، اور علم و ادب کے اُفق پر ایک روشن ستارہ۔

☆☆☆☆☆

خالد علیم.... ایک نستعلیق آدمی

بیسویں صدی کے آسمانِ ادب پر چمکنے والے تابندہ ستاروں کے مانند متعدد نام سامنے آئے جنھوں نے اُردو ادب کا دامن اپنی تخلیقاتِ نظم ونثر کے پھولوں سے بھر دیا جن کی خوشبو آج بھی کتابوں کے اوراق کھولنے سے عیاں ہوتی ہے۔ ابتدا میں کچھ ادبی شخصیات نے خود کو بہ حیثیت شاعر و نثر نگار پیش کیا تو کچھ شاعر خود آگاہی کے تحت ابتدا ہی سے شاعری کرتے رہے، آج وہ اپنے اسلوب اور ندرتِ خیال کی بنیاد پر ''آبروئے غزل'' بن گئے ہیں۔ ایسی ادبی شخصیات بہت کم ہیں جو شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری میں بھی اپنے جوہر دکھانے پر دونوں ہی میدانوں میں یکساں مقبول اور کامیاب ٹھہرے۔ ایسے اہلِ قلم میں سے معتبر اور سنجیدہ نام خالد علیم کا ہے جن کا شمار اُردو کے بلند فکر شاعروں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے اپنی شاعری کی بنیاد اپنے عہد کے مسائل و افکار پر رکھی۔ ان کے علم وفن کی روشنی سے کائنات اُردو ادب میں اُجالا ہی اُجالا ہُوا۔ ان کی علمی استعداد، تعلیمی قابلیت اور خداداد صلاحیت سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ ان کے والدِ گرامی علیم ناصری بھی اُردو کے ممتاز نعتیہ شاعر اور عمدہ نثر نگار تھے۔ حضرت علیم ناصری اور ان کے فرزندِ ارجمند خالد علیم دونوں اسلامی ادب کے قابلِ احترام نمائندے ہیں۔ خالد علیم ایک ہمہ جہت اور ہمہ صفات شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت میں کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں تھا، وہ ایک وسیع المطالعہ شاعر تھے، وہ زبان و بیان اور اسلوب تازہ کے ساتھ فکر و مشاہدات، جذبات و احساسات پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ وہ بنیادی طور پر شعری آہنگ میں انفرادیت کے حامل تھے، ان کا مزاج شاعرانہ

صدام ساگر

ترقی پسند اور تلاش و جستجو سے معمور تھا۔

خالد علیم روحانی اقتدار کے حامل، درویش صفت، شفیق دوست ہونے کے ساتھ ساتھ ظاہر و باطن سے آئینہ صفت، صاف گو اور نستعلیق انسان تھے۔ انھوں نے شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی اور اس خوش اسلوبی اور انوکھے انداز سے اپنی فنی و فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لائے کہ اہلِ دانش دنگ رہ گئے۔ ان کے حمدیہ کلام کو جب فنی و فکری لحاظ سے پرکھتے ہیں تو اس بات کا گماں بار بار ہوتا ہے کہ ان کے طرزِ احساس میں جدت، سادگی، روانی اور صفائی اپنی مثال آپ ہیں۔ کہتے ہیں کہ ”جب حمد زبان سے دل پر حرفِ دعا بن کر نغمہ ریزی کی جلوہ آرائی کا سامان کرتی ہے تو قلب و روح اللہ کی نورانیت سے معمور و منور ہو جایا کرتے ہیں۔ یہی کیفیت ہم پر خالد علیم کی حمدیہ شاعری پڑھتے ہوئے طاری ہو جاتی ہے۔ ان کے چند حمدیہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

جو تیری حمد کو ہو خوش رقم، کہاں سے آئے
وہ روشنائی، وہ نوکِ قلم کہاں سے آئے
گناہ گار ہوں اے میرے مہربان خدا!
اگر گناہ نہ ہوں، چشمِ نم کہاں سے آئے

....

خالد علیم کے حمدیہ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قرآن و احادیث کا گہرا مطالعہ کیا ہوا ہے۔ اسی لیے تو ان کے کلام میں قرآن و سنت کے پاکیزہ اصولوں کے آبدار موتی دل و نظر کو آگہی خداوندی سے سرفراز کرتے ملتے ہیں۔ اسی طرح جب وہ نعت کہنے کے لیے قلم اُٹھاتے ہیں تو پہلے درودِ نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے لبوں پر سجاتے، اشکوں سے باوضو ہوتے اور اپنے تصور میں گنبدِ خضریٰ کی جالیوں کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے اپنی پلکوں سے نعلینِ نبیؐ سر پر اُٹھائے حضورؐ کی بارگاہِ اقدس سے اجازت طلب کرتے ہیں۔ اس طرح وہ نعت کے پاکیزہ عمل سے گزرتے ہیں۔ اسی لیے ان کے کلام میں دلکشی، تاثر آفرینی، مٹھاس، دلپذیری اور غنائیت پائی جاتی ہے۔ ان کی نعت کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

دانائیاں تمام ہوئی جب جہان سے
اُترا نبیؐ کا نطقِ جمیل آسمان سے
انساں کو دے گیا وہ عجب جاں گدازیاں
جو لفظ بھی ادا ہوا اُنؐ کی زبان سے

اسی نعت کا مقطع دیکھیے:

خالد میں نعت گو کا پسر ہوں تو کیوں نہ ہو
ذکرِ رسولؐ ، اور مرے خاندان سے!

....

نعتیہ شاعری کی بنیاد ذاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت و عقیدت کا جذبہ ہے۔ یہ نعت گوئی کا تقاضا ہی نہیں، ہمارے ایمان کا حصہ بھی ہے۔ ہمارا ایمان اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ہم اپنی ہر چیز اپنے تمام رشتوں سے زیادہ نبیؐ کریم کی ذات سے محبت کرنے اور اُن کا اتباع کرنے والے نہ بن جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ خالد علیم آب بقا کے نہیں جامِ کوثر کے تمنائی ہیں۔ ان کے نعتیہ شعری مجموعہ ”محامد“ سے چند اشعار دیکھیے:

نعتِ رسولِؐ کریم سوز و گداز و سرور
نعتِ رسولِؐ کریم کیفِ شرابِ طہور
نعتِ رسولِؐ کریم علم و خبر کا نزول
نعتِ رسولِؐ کریم فکر و ہنر کا ظہور

....

کیسے کروں نعت میں اُس کے محاسن بیاں
میرا بیاں بے اثر، میری زباں ناتواں
میں ہوں غریب و فقیر، بے بصرو کم سواد
وہ ہے حبیبِؐ خدا، فخرِ زمان و مکاں

....

ہاں وہ رسولِؐ انام، سیدِ عالیٔ جناب
بحرِ رسالت کا وہ اک گہرِ انتخاب
اُس کا نفس مشکبو، اُس کی نظر گل فشاں
اُس کا تکلم لطیف، اُس کا تبسم گلاب

....

ملا ہے مجھ کو فرقت میں تڑپنے کا قرینہ
مرے اشعار میں سوز و گداز جاوداں ہے
کرم، اللہ کا ہے، لکھ رہا ہوں نعت اُس کی
مجھے اس باب میں اظہار کی جرات کہاں ہے

....

خالد علیم کی نعت کا نمایاں ترین وصف سادگی ہے۔ وہ نعت کہتے ہوئے بے حد محتاط شاعرانہ رواویہ اختیار کرتے، ان کے نعتیہ کلام میں کوئی ایسی بات نہیں آتی جو آداب کے منافی ہو۔ انہوں نے اپنے نعتیہ کلام میں فنی پیرائے کا استعمال کرتے ہوئے اپنے نبیؐ کریم کے سچے اُمتی ہونے کا حق ادا کر دکھایا ہے۔ ان کی نعت گوئی کے حوالے سے خورشید رضوی لکھتے ہیں کہ ”خالد علیم کی نعت میں جذبے، علم اور ریاضتِ فنی کا ایک ایسا امتزاج ملتا ہے جو عجلت کے اس دور میں بہت کم یاب ہے۔ یہ ریاضتِ فنی ان کے ہاں حسب کے علاوہ نسب کا درجہ بھی رکھتی ہے کہ جس گھر میں ”شاہنامۂ بالاکوٹ“ اور ”طلع البدر علینا“ کا طلوع ہوا ہو، اتنی ریاضت تو اس کی فضا میں رچی ہوئی ہوتی ہے۔“

خالد علیم کا کمال یہ ہے کہ ان کے نعتیہ کلام کا لفظ لفظ روح میں اُترتا چلا جاتا ہے، لہو کے گنبد میں صدا لگاتا ہے، دماغ میں گھومتا، دل میں دھڑکتا نظر آتا ہے۔ کیوں کہ انہوں نے اپنی تمام نعتوں میں محاسنِ کلام کا خاص خیال رکھا ہے اس لئے معانی سے قطع نظر، فنی پہلو سے بھی ان کی نعتیں، نعتیہ ادب کا ایک بیش بہا خزینہ ہیں۔ پھر انہوں نے نعت میں بعض نہایت سحر آفریں تجربے بھی کئے ہیں۔ پروفیسر جعفر بلوچ کے مطابق ”خالد علیم کی غیر معمولی قدرتِ کلام ہر ادب پرست قاری کو متاثر کرتی ہے، انہوں نے متعدد اساتذہ فن کی زمینوں اور متعدد مشہور و معروف قصیدوں یا شعری شاہکاروں کے تسلسل میں دادِ سخن دی ہے اور اپنے نقوشِ کمال کی آب و تاب کو کہیں مدھم نہیں ہونے دیا۔ وہ مشکل اور کم مروج زمینوں اور بحروں میں بھی بڑی کامیابی اور حیرت انگیز سہولت کے ساتھ تخلیقِ فن کی منزلیں طے کرتے ہیں۔ انہوں نے مردف زمینوں میں بھی متوجہ کرنے والے شعر نکالے ہیں۔ پابند و آزاد فنی ہئیتیں ان کے وجدانی ریموٹ کنٹرول کے اشاروں کی فوری اور بلا تامل اطاعت کرتی

ہیں، خالد علیم کی حمدیہ و نعتیہ رباعیات بھی ایک شان رکھتی ہیں، رفعتِ فن اور تقدسِ موضوع کے حوالے سے یہ رباعیات ہمیں رباعیاتِ امجد حیدرآبادی کی یاد دلاتی ہیں۔"

خالد علیم نے صنفِ رباعی کو بھی اپنے حمدیہ، نعتیہ، دعائیہ اور غزلیہ کلام میں خاص جگہ دی ہے۔ صنفِ رباعی کے لیے اہلِ عروض نے ایک خاص بحر مقرر کی ہوئی ہے اگر اس بحر کے مروجہ چوبیس زحافات کے مقرر ارکان پر کوئی رباعی نہ آتی ہو تو اسے ہرگز رباعی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ وہ چومصرعی تو ہو سکتی ہے لیکن رباعی نہیں۔ چونکہ رباعی زحافات کی باریک بینیوں کی وجہ سے مشکل شعری صنف تصور کی جاتی ہے۔ لیکن خالد علیم نے اس صنف میں اپنی جودتِ طبع اور ندرتِ خیالی کا لوہا منوایا ہے اس کا اندازہ آپ تنقیدی شعور کے حامل نقاد نوید صادق کی اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ "خالد علیم کی رباعیات حمدیہ، نعتیہ، دعائیہ موضوعات کے ساتھ ساتھ تاریخی و سماجی شعور، سیاسی ادراک اور اخلاقیات کو محیط ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں رباعی کا شہ موضوع معاملاتِ محبت ہے۔ لیکن یہ محبت وہ محبت نہیں جس کا عموماً چرچا رہتا ہے۔ خالد علیم کی محبت میں تمام کائنات در آئی ہے۔ فرد کی ذہنی و قلبی کشاکش کی عکاس رباعیات خالد علیم کے ہاں گہرے انسانی شعور کا پتہ دیتی ہیں۔ ان کی رباعیات میں تغزل کی آمیزش لائقِ تحسین و توجہ ہے۔" اس ضمن میں ان کی چند رباعیات دیکھیے:

تو عالمِ بے حصار، میں ایک سراب
تو قلزمِ بے کنار، میں ایک حباب
ہیں تیرے طلوع سے ازل اور ابد
ہے میرے غروب سے زمانوں کا حجاب

....

اے ربِ ذوالجلال! روشن کر دے
مولائے لایزال! روشن کر دے
ہوں سر بہ سجود میں فقط تیرے حضور
مجھ پر اپنا جمال روشن کر دے

....

ان کی نعتیہ رباعیات میں بھی ایسی ہی عقیدت اور محبت کے گلدستے مہکتے ہیں، ان کی نعتیہ رباعیات میں ایک روحانی، وجدانی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کی نعت گوئی سیرتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ پاک کے تمام تر پہلوؤں کو محیط ہے۔ رسولِ پاک کے اوصافِ حمیدہ اور ان کے القابات کی وسعت کا احاطہ کرنا کسی بھی انسان کی فہم و فراست کے لیے مشکل ہے۔ نعت کے علاوہ ان کی رباعیوں میں دنیا کے تمام تر موضوعات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ نوید صادق کے بقول:

"خالد علیم نے صنفِ رباعی کے جمالیاتی تقاضے بھرپور انداز میں نبھائے ہیں، ان کا اسلوب دلکش ہے۔ تغزل کا عنصر ان کی رباعیات میں قاری کی دلچسپی بڑھاتا ہے۔ ان کی رباعیات میں جمالیات آسودگی کے باعث دل و نظر کے ساتھ ساتھ روحانی مسرت کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کی ہر

رباعی میں قاری کو اپنی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔"

ان کی بہت سی رباعیات کے اشعار دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑ دیتی ہیں:

ہر سمت مچا اندھیر تھا، کچھ بھی نہ تھا
میری قسمت کا پھیر تھا، کچھ بھی نہ تھا
پہنچا تجھے ملنے تو نظر کے آگے
مٹی کا ایک ڈھیر تھا، کچھ بھی نہ تھا

....

خالد علیم کی نظموں پر ایک نظر ڈالیں تو انہوں نے اپنے تلخ و شیریں تجربات، عمیق مشاہدات، شدید جذبات اور نازک خیالات کو بڑے سلیقے سے شعری آہنگ عطا کیا ہے۔ ان کا اندازِ تکلم بڑا مودب اور اندازِ تخاطب نہایت مہذب ہے۔ وہ عوام و خواص کی نفسیات سے خوب واقف تھے اور معاشرے پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اس معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی قریب کی عینک سے اُسے جانچ لیتے تھے، ان کی نظمیں پڑھ کر ن۔ م راشد اور مجید امجد یاد آ جاتے ہیں۔

خالد علیم کی نظمیں قارئینِ شعر و سخن، ناقدینِ فنِ شاعری اور مشاہیرِ اُردو ادب کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے میں دیر نہیں لگاتی، ان کی نظموں کو پڑھتے ہوئے تھکن محسوس نہیں ہوتی بلکہ جی چاہتا ہے کہ انہیں پڑھتے ہی چلے جائیں، ایسے میں ان کی ایک نظم "کوئی نم نہ رہنے دو" آپ سب بھی میرے ساتھ پڑھیے:

ہمارے زخم تو چھیلے گئے ہیں
ہاں! لہو بہتا ہے، بہنے دو
بدن دُکھتا ہے، دُکھنے دو
اب ان زخموں پہ تم مرہم نہ رکھو
زخم بھر بھی جائیں تو بھرنے سے کیا ہوگا
ہماری آنکھ کا سارا لہو بہہ جائے تو بہنے سے کیا ہوگا
ہماری آنکھ سے جتنا لہو بہتا ہے، بہنے دو
ہمارے چاک رہنے دو
ہمارے چاک سل بھی جائیں تو سلنے سے کیا ہوگا
ہمارے زخم بہنے دو
ہماری آنکھ کی پتلی میں کوئی نم نہ رہنے دو

....

خالد علیم کی نثری نظموں میں بڑے شہروں، دیہاتی زندگی اور بڑے انسانوں کے تجربات اور دُکھی افراد کی آہ و فغاں شامل ہے۔ ان کی آواز میں صداقت اور محبت کو دل سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی نظموں میں اپنے ماحول کی عکاسی، حالات و واقعات کی ترجمانی اور حقیقی زندگی کی سچی تصویر کشی ملتی ہے۔ ان کی نظموں کے نمایاں موضوعات نئی نسل کا المیہ، کرب، گمرہی، انتظار، وصل و ہجر، واقعہ کربلا، فلسطین، کشمیر، محبت میں مسافت کی اذیت، درد کی پرچھائیں اور وسائلِ زندگی سے محرومیاں ہیں۔ اسی طرح ان کے غزلیہ اسلوب کی بات کی جائے تو خالد علیم کی غزل پیغام آفریں ہے ان کے کلام میں مضمون آفرینی بھی موجود ہے اور خیال آفرینی بھی۔ ان کی شاعری میں ان کا اپنا ذاتی عکس انفرادی سے زیادہ اجتماعی نظر آتا ہے ان کے اکثر اشعار فکری شعور و آگہی لیے ہوئے ہیں جن میں لب و لہجہ کی توانائی اور فکر کی گہرائی ان اشعار کی صورت میں

بھرپور انداز میں ملتی ہے:

کبھی تمہارے، کبھی اپنے آسمان میں گم
نکل پڑا میں کسی راہ کے گمان میں گم
نہیں کہیں ہے وہ خالد، ابھی نہ ٹوک مجھے
ابھی تلاش میں ہوں، رہگزر کے دھیان میں گم

....

یوں چشمِ نم ہے رنگِ غزل سے بھری ہوئی
جیسے ہو جل پری کوئی، جل سے بھری ہوئی
سانسوں میں روز گھولتی ہے بے بسی کا کرب
جینے کی پیاس وقت کے تھل سے بھری ہوئی

....

وقت کی اپنی چال تھی اور مجھے خبر نہ تھی
رات کی منزل اور تھی، صبح کا اور جادہ تھا

....

ہوا ماتم کرے، سورج کی تابانی سے ڈر جائے
اگر اُترے مرے گھر میں تو ویرانی سے ڈر جائے
مرے حصے میں جو کچھ آ چکا خالد، غنیمت ہے
کشادہ رزق اپنی جلوہ سامانی سے ڈر جائے!

....

خالد علیم نے غزل کے پیکر میں نہ صرف اپنے تجربات و مشاہدات کے حسین رنگ بھر دیے ہیں بلکہ انہوں نے اپنے سبھی تلخ جذبات کو محبت کی مٹی میں گوندھ کر کاغذ کے نرم ٹکڑوں پر ستاروں کے مانند رکھ دیا ہے۔ دنیا میں جہاں بہت سے لوگ فاقہ کشی، انا پرستی اور ذاتی ضروریات کے تحت جھگڑا، فسادات کے معاملات سے گزر رہے ہیں وہیں خالد علیم جیسا شخص دوسروں سے الگ اپنا مزاج رکھتا تھا۔ ان کے مزاج میں نرمی ہر موسم میں رہتی تھی۔ وہ ایک سدابہار اور خوشبودار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے مزاج کو سمجھنے کے لیے ان کے یہ اشعار کافی ہوں گے:

یہ تو نہیں کہ بس مجھے وحشت زیادہ ہے
اس شہر کے مزاج میں شدت زیادہ ہے
ہر روز میرے تن سے لہو کھینچتا ہوا
وہ دوست کم ہے، اپنی ضرورت زیادہ ہے

....

اسی غزل کے مقطع میں بڑے کام کی بات کرتے ہیں کہ:

انصاف چاہتا ہے تو لہجہ درست کر
خالد ترے بیان میں نصیحت زیادہ ہے

....

خالد علیم اپنے عہد کے نرم لہجے کے شاعر تھے، بات کو بہت سلیس، سادگی اور سہل انداز میں بیان کرتے تھے۔ وہ عام فہم بات کہنے کا فن بخوبی جانتے تھے۔ ان کو اپنی بات موثر بنانے کا ہنر آتا تھا۔ اسی لیے احمد ندیم قاسمی مرحوم کا لکھتے ہیں:

''اس کی غزل اور نظم جدید تر حسیات کی ترجمان ہیں۔ ان میں وہ عصر بولتا ہے جس میں خالد علیم تخلیقِ فن میں مصروف ہے۔ اس کی غزل خاص طور پر دامنِ دل کو کھینچتی ہے کیوں کہ کلاسیکی غزل کی جملہ مثبت روایات کے احترام کے ساتھ ہی اس کی غزل میں بیسویں صدی کا وہ ربع انعکاس پذیر ہے جس نے جدید غزل کو ایک منفرد تشخص بخشا ہے۔ یہ غزل تغزل سے بھی آراستہ ہے اور شاعر کے گردوپیش رواں دواں زندگی کے حساس

پہلوؤں سے بھی کسبِ جمال کرتی ہے۔"

خالد علیم کی شاعری کو بھی میر و غالب و مومن و ذوق کی اسی شعری روایت کا تسلسل قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ بلکہ اس سلسلے میں خالد علیم کی نسبت محض تصوراتی یا تخیلاتی نہیں بلکہ فلسفیانہ اور دانشورانہ ہے۔ خالد علیم اکیسویں صدی کا ذہن رکھتے تھے ان کے ہاں زندگی کا شعور اور حسن کا ادارک خوب ملتا ہے، مگر اس ادراکِ حسن و زندگی پر تصوراتِ غم کی خالص انسانی کیفیات کا غلبہ رہا۔ زندگی کا قدرتی اور فطری جمال بھی ان کا مطمحِ نظر رہا، وہ اپنی سوچ اور احساس میں دوسرے ذہنوں کو ہم سفر بنانے کی خواہش رکھتے تھے۔ یاد رہے کہ وہ موجودہ دور کے ساتھ اپنی سابقہ روایات سے پوری طرح وابستگی رکھتے تھے۔ انہیں حسرت موہانی کی طرح عاشقی کا وہ زمانہ یاد رہتا ہے۔ وہ آنکھوں دیکھے قدرت کے سبھی مناظر کی منظر کشی کچھ اس طرح کرتے:

اس بھری شاخ سے نکلے کوئی منظر میرا
آسماں تک تو گیا ہاتھ برابر میرا

میں یہ دو پل کی اذیت بھی کہاں لے جاؤں
کبھی دو پل وہ کسی کا، کبھی اکثر میرا

....

وہ پاکستان سمیت دنیا بھر میں ہونے والی بدحالی، ظلم کی داستانوں پر کلمۂ حق کہنے والی زبانوں پر تالا لگ جانے کی صورت میں اپنا قلم کچھ اس طرح اُٹھاتے ہیں:

سب ٹھیک ہے، جو ہو رہا ہے شہر میں، سب ٹھیک ہے
کیا تبصرہ اس پر کریں، جب ٹھیک ہے، تب ٹھیک ہے

کیا کیا غلط اور کیوں غلط، ہم ہی بتائیں اور کیوں
جو ہو رہے گا، دیکھ لیں گے، جو ہوا، کب ٹھیک ہے

....

ان کے یہ اشعار پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک نہیں ساری دنیا کا نظام خرابی کی تصویر بنا ہُوا ہے۔ ایسا نظام جو اللہ نے انسانوں کے ہاتھ میں تھما رکھا ہے۔ جس میں نئے مکانوں میں بھی شہر کی ویرانی گھس بیٹھی ہو اور جہاں کے مکین ایک دوسرے سے بھی خوف زدہ اور سہمے سہمے رہتے ہیں، جہاں دو چار پتھر اِدھر اُدھر سے صحن میں آ گریں تو بارشِ سنگِ ملامت کا شائبہ ہونے لگے، لوگ ہاتھوں میں پھولوں کے بجائے ہاتھ لہو سے رنگے ہوئے پھرتے ہیں، خالد صاحب ایسے بے مروت لوگوں کا سانحہ بیان کرتے ہیں جنہیں محبت اور وفا کے پھول کھلنے کی قوی اُمید تھی۔ اس حوالے سے سلیم کوثر رقم طراز ہیں کہ:

"خالد علیم محبتوں سے لبریز خوشبو اُڑاتا ہوا ایک دھنک رنگ شاعر ہے۔ اداسیوں کے سے خوشیوں کی مہک بانٹنے والا ایک دل دار آدمی ہے۔ اس دورِ حرص و ہوس میں خود کو محسوس کرواتا ہوا ایک نیک نامی کا خوب صورت لمحہ آتے جاتے موسموں کی تمثیل میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس کے خوابوں کا اظہار اتنا واضح اور اُمید کا ایسا آئینہ ہے جس میں نئی دنیا کے عکس جھلمل کرتے ہیں۔ خالد جیسے محنت، مسلسل محنت پر یقین رکھنے والے شاعروں میں شاعر و ادیب ہونا کوئی آسان

کام نہیں ہے۔"

خالد علیم گزری ہوئی اور آنے والے تمام صدیوں کا شاعر تھا، وہ ایک پختہ لہجہ لیے ہوئے ایک قادر الکلام، اُستاد شاعر کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کی شاعری میں ریاضت واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ شاعری کے جملہ معیارات جو اساتذہ نے ان سے قبل بیان کیے اُن سے پوری طرح آشنا تھے۔ خالد علیم سچائی اور حقیقت کے باکمال شاعر تھے ان کی شاعری میں رکھ رکھاؤ اور محاسنِ کلام کا معیار صاف ستھرا ہے۔ خالد علیم ایک نہیں بلکہ پوری انسانیت کی زندہ رہنے والی آواز تھے۔ اس شعر کے مصداق:

سنتے آئے ہیں کہ دیوار تھی دیوار کے ساتھ
ہر مکاں دور تلک ایک مکاں تھا پہلے

اسی طرح ان کا ایک شعر جو مجھے بہت پسند ہے:

خالد یہ سوچتے ہی مرا ہاتھ رُک گیا
دیتے نہیں ہیں دستکیں خالی مکان پر

....

خالد علیم کے ایسے بے شمار اشعار زباں زدِ عام ہیں، لوگوں کے دلوں میں محفوظ ہیں جو ان کے فن کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ ان کی تمام شعری اصناف پر جتنا بھی لکھا جائے، کم ہوگا۔ ان کی تصانیف میں "فغان دل"، "شام شفق تنہائی"، "کوئی آنکھ دل سے بھری رہی"، "بغداد آشوب" نظموں کا مجموعہ، اُردو شاعرات کی نعتیہ شاعری سے متعلق تحقیقی کتاب، "تمثال" رباعیات پر مبنی شامل ہیں۔ ان کی اہم تصانیف میں "دائرے میں قدم" (ناولٹ)، "کلیات نما"، "اوصاف" (نعتیہ قصاید)، "فغانِ دل"، اردو شاعرات کی نعتیہ شاعری، "شام، شفق، تنہائی"، "کوئی آنکھ دل سے بھری رہی" اور "بغداد آشوب" قابلِ ذکر ہیں۔ میرے پاس ان کا ناولٹ "دائرے میں قدم" موجود ہے جس کا مطالعہ میں کئی بار کر چکا ہوں، اُردو میں ناولٹ کے حوالے سے بہت سا الجھاؤ ہے اور اس کی کتابوں میں یا اہلِ دانش کے ہاں کوئی واضح تعریف موجود نہیں۔ بنیادی طور پر ناولٹ ناول کی ایک چھوٹی شکل ہے، جس طرح مختصر افسانے کو طویل افسانے سے الگ کرنے کا کوئی حتمی اصول نہیں اسی طرح ناول اور ناولٹ کے درمیان بھی حدِ فاصل کھینچنا مشکل ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے "ایک چادر میلی سی" کو بھی ناولٹ کہا جاتا ہے۔ ناولٹ میں عام ناولوں کی طرح کرداروں کی کثرت یا قصہ در قصہ واقعات کا بیان بالعموم نہیں ہوتا۔ ناولٹ کی پوری کہانی عام طور پر ایک ہی واقعے کے گرد گھومتی ہے اور اس کا زمانی پس منظر بھی بہت وسیع نہیں ہوتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اردو میں ناول ہی کا حکم رکھنے والے بہت سے ناولٹ موجود ہیں۔ عصمت چغتائی کا "ضدی" اور انتظار حسین کا "چاند گہن" بھی اردو میں ناولٹ کی معروف مثالیں ہیں۔ اسی طرح خالد علیم کا "دائرے میں قدم" بھی ناولٹ ہی کہلائے گا۔ انہوں نے کہانی کو بیان کرنے کا جو اسلوب اپنایا ہے وہ ایک اچھے فکشن نگار ہونے کا ثبوت دیا۔ خالد علیم 1956 کو کراچی میں پیدا ہوئے، وہ معروف شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار

اور محقق کے طور پر اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ وہ ''فانوس'' رسالے کے مدیر بھی رہے اور ''الاشراق'' ادارے کے منتظم کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔

خالد علیم سے میری پہلی ملاقات آج سے آٹھ سال قبل بھائی نوید صادق کے توسط سے جیل روڈ لاہور میں ان کے دولت کدہ پر ہوئی۔ جہاں وہ کرائے پر سکونت اختیار کیے ہوئے تھے۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی تو اکثر رفتگانِ سخن کا ذکرِ خیر بڑے ذوق وشوق سے کرتے۔ ان سے جب بھی ملاقات یا فون پر بات ہوتی تو ہماری گفتگو میں بھائی نوید صادق کا تذکرہ ضرور ہوتا۔ نوید صادق اس حوالے سے خوش قسمت ہیں کہ ان کی شفقت اور محبت کا زیادہ حصہ انھیں نصیب ہُوا۔ میری جب بھی نوید بھائی سے بات ہوتی تو خالد صاحب سے اکٹھے ملاقات کا پروگرام طے ہوتا جو میری مسلسل وعدہ خلافیوں کے باعث ملتوی ہو جاتا۔ کئی بار ان سے ملاقات اُردو بازار میں پیارے دوست زاہد محمود زاہد کے دفتر دھنک مطبوعات میں ہوتی جہاں چائے کے ساتھ ادبی، علمی گفتگو کا سلسلہ تادیر چلتا۔ 2021 میں جب ان کی ''کلیات نما'' شائع ہوئی تو مجھے بھی تحفتاً ملی۔ جس پر میں نے جلد تبصرہ لکھنے کا وعدہ کر لیا یوں ان کی زندگی میں یہ وعدہ نہ نبھا سکا۔ آخر کار جب ان کی وفات 10 فروری 2025 کے روز لاہور میں ہوئی تو میں اپنے کیے وعدوں پر بہت شرمندہ ہُوا۔ کہ ہائے کتنا بڑا آدمی تھا جو ہمارے درمیان موجود تھا۔ ان کی وفات کی خبر سن کر کچھ دن تک میں غمگین رہا۔ تین دن گزرنے کے بعد جب نوید صادق سے بات ہوئی تو انھوں نے بتایا ساگر، خالد علیم صاحب کی جب وفات ہوئی تو میرے گھر پر میری بانہوں میں تھے۔ یہ بات سن کر میری آنکھوں سے ایک بار پھر اشکوں کی بارش شروع ہو گئی۔ ہم دونوں بھائی، خالد صاحب کی یادیں اور باتیں یاد کر کے ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے رہے۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا: ''خالد بھائی! صبر رکھیں''، تو نوید بھائی نم دیدہ آنکھوں اور اُداس چہرے سے مسکرا کر بولے ''ساگر تم نے مجھے خالد بھائی کہا، میں بہت خوش ہُوا۔'' یہ بات سچ ہے کہ خالد علیم اپنے خالق کے پاس چلے گئے ہیں لیکن وہ اپنی خوشبو نوید صادق میں چھوڑ گئے ہیں اب جس نے بھی خالد علیم سے ملنا ہو وہ نوید صادق سے ضرور ملے۔ خالد علیم کے وفات سے دنیائے ادب کی فضا تادیر تک سوگوار رہے گی۔ اللہ ان کی قبر پر اپنی رحمتوں کے پھول نچھاور کرے اور آخرت کی منزلوں کو آسان فرما کر دنیا کی طرح روزِ محشر بھی اپنے حبیبؐ کے صدقے عزت و برکت سے نوازیں۔ آخر میں بشیر بدر کے اس شعر کے سوا اور کیا کہا جائے:

وہ جن کے ذکر سے رگوں میں دوڑتی تھیں بجلیاں
اُنہیں کا ہاتھ ہم نے چھو کے دیکھا کتنا سرد تھا

☆☆☆☆☆

رموز و اوقاف کی اہمیت

اُردو زبان و ادب میں رموز و اوقاف اور اعراب بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایک زیر زبر یا پیش سے ہی بات کے معنی یکسر بدل جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر لفظ گ پر پیش ہو تو یہ گُل ہے اگر گ کے نیچے زیر ہو تو یہ گِل ہے۔ گُل کا معنی پھول ہے اور گِل کا معنی مٹی ہے۔ اگر لفظ "منتظر" میں حرف ظ کے نیچے زیر ہو یعنی "منتظِر" تو اس کا معنی ہے انتظار کرنے والا، لیکن اگر حرف ظ کے اوپر زبر ڈال دیا جائے یعنی "منتظَر" لکھیں تو اس کے معنی یکسر بدل جائیں گے۔ مُنتظَر کا معنی ہے جس کا انتظار کیا جا رہا ہو۔ مُنتظِر - انتظار کرنے والا اور مُنتظَر - جس کا انتظار کیا جا رہا ہو۔ اس تناظر میں علامہ اقبال کا شعر دیکھیں:

کبھی اے حقیقتِ مُنتظَر، نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

....

ہمارے ہاں اکثر مردوں کا نام منتظر مہدی ہوتا ہے۔ اس نام کو مُنتظِر Muntazir لکھنا اور پڑھنا چاہیے۔ مُنتظِر مہدی Mehdi Muntazir یعنی امام مہدی کا انتظار کرنے والا۔ Muntazar Mehdi لکھنا مناسب نہیں۔

ویسے تو مَیں نے 16 سال کی عُمر میں دیوانِ غالب پڑھنا شروع کیا تھا لیکن غالب کے بعض اشعار کی اب 48 سال کی عُمر میں آ کر مجھے درست تفہیم ہونا شروع ہوئی ہے۔ کچھ عرصہ قبل غالب کے ایک شعر کی درست تفہیم مجھے درست اعراب لگانے کی وجہ سے ہوئی۔ مَیں نے سوچا کہ دوستوں کے ساتھ شیئر کر دوں تاکہ میری طرح وہ بھی اُردو ادب میں اعراب کی اہمیت کو سمجھ پائیں۔

غالب کا شعر ہے:

جاری تھی ابھی داغِ جگر سے مری تحصیل
آتش کدہ جاگیرِ سَمَندر نہ ہوا تھا

....

عمران حیدر تھہیم

اس شعر میں لفظ ''سمندر'' پر غور فرمائیں۔ اس لفظ میں اگر حرف م پر پیش ہو یعنی ''سمُندر'' تو اس کے معنی ہیں بحر، ساگر یعنی body water اور یہ لفظ ہندی زبان سے اُردو میں شامل ہوا ہے۔ لیکن اگر اس لفظ میں حرف م پر زبر ڈال دیا جائے تو یہ فارسی زبان کا لفظ ''سمَندر'' بن جاتا ہے۔ قدیم فارسی لٹریچر کے مطابق خیال کیا جاتا تھا کہ اگر کسی جگہ پر ایک ہزار سال تک آگ روشن رکھی جائے اور اُسے بُجھنے نہ دیا جائے تو اُسی آگ کے اندر سے ایک ایسا خیالی کیڑا پیدا ہوگا جو اُس آگ کو خود ہی کھا جائے گا۔ اس خیالی کیڑے کو فارسی زبان میں ''سمَندر'' کہا جاتا ہے۔ اب غور کریں کہ اگر غالب کے اس شعر میں لفظ سمُندر رکھا جائے تو اس کی سادہ سی تشریح یہ ہوگی کہ ابھی تک میرے جگر میں روشن آتش سے میری تحصیل جاری ہے اور یہ آتشکدہ ابھی تک کسی bodywater یعنی کسی بحر کی جاگیر نہیں بنا یعنی ابھی تک جگر کی آگ بجھی نہیں۔ دیکھا جائے تو یہ ایک عامیانہ سی بات ہے اور اگر ہم تصور کرلیں کہ غالب نے لفظ ''سمُندر'' ہی استعمال کیا ہے تو یہ شعر عام سا رہ جاتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ غالب نے فارسی والا لفظ ''سمَندر'' استعمال کیا ہے۔ کیونکہ اُردو زبان میں دو الفاظ کا مُرکب صرف فارسی فارسی یا عربی اور فارسی الفاظ کو ملا کر ہی بنایا جاسکتا ہے۔ لفظ ''سمُندر'' ہندی لفظ ہے، اس لیے ''جاگیرِ سمُندر'' کی ترکیب غلط ہے۔ کم از کم غالب یہ غلطی نہیں کرسکتے تھے۔ لہٰذا اُنھوں نے لفظ ''سمَندر'' کا استعمال کرکے ترکیب ''جاگیرِ سمَندر'' اس شعر میں شامل کی۔ اب اگر آپ اُس خیالی کیڑے ''سمَندر'' کے ساتھ شعر کو سمجھنے کی کوشش کریں تو آپ کو اس شعر کی اصل تفہیم ہوگی۔ یعنی غالب کہتے ہیں کہ اپنے داغِ جگر یعنی اپنے رنج والم کے سوز سے ابھی مَیں جو نتیجہ حاصل کرنا چاہتا ہوں اُس کا حاصل کرنا ابھی جاری ہے کیونکہ ابھی تک میری جستجو کی یہ آتش اس مقام پر نہیں پہنچی کہ اُس کے اندر سے وہ خیالی کیڑا ''سمَندر'' پیدا ہوگیا ہے اور وہ اس آگ کو کھا جائے گا۔ مطلب میری جستجو اور کاوشیں ابھی جاری ہیں:

جاری تھی ابھی داغِ جگر سے مری تحصیل
آتش کدہ جاگیرِ سمَندر نہ ہُوا تھا

دیکھا نہ تھا جب تک کہ قدِ یار کا عالم
مَیں مُعتقدِ فتنہءِ محشر نہ ہُوا تھا
(غالب)

اُمید ہے آپ لوگ آئندہ اُردو زبان وادب میں اعراب کی اہمیت کو سمجھیں گے۔

وما علینا الا البلاغ----

☆☆☆☆☆

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو

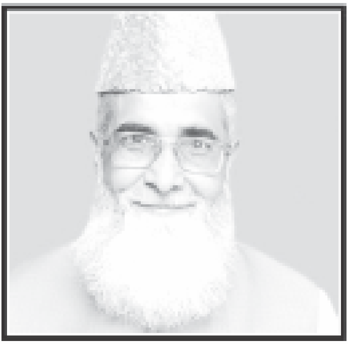

ماضی کے حوالے سے تین حقیقتیں ناقابلِ انکار ہیں، ایک تو انسان جہاں بھی پہنچ جائے اپنے ماضی کو نہیں بھول سکتا، دنیا کے حسین تر شہر کا باسی بھی بن جائے اپنے گاؤں کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا، دوسری یہ کہ ماضی لوٹایا نہیں جاسکتا، وقت کا گھوڑا دوڑتا اور سرپٹ بھاگتا چلا جاتا ہے، نہ اسے کوئی روسکتا ہے نہ ہی گزرے وقت کو واپس پلٹا سکتا ہے:

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
(اقبال)

اور تیسری حقیقت یہ ہے کہ ماضی کو کوئی بھی فراموش نہیں کرسکتا- ہر کوئی اپنے ماضی کی حسین یادوں میں جیتا ضرور ہے لیکن اسے بیان کرنے کا ملکہ ہر کسی کے پاس نہیں:

یہ الگ بات کہ تعبیر نہ ہونے پائیں
ورنہ ہر دل میں کچھ تاج محل ہوتے ہیں

....

پروفیسر سید اظہار الحسن بخاری ایک ایسے باوقار اور قسمت کے دھنی انسان ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے ایک وجیہہ شخصیت بنایا ہے- جن کی پوری زندگی ایک باوقار طریقے سے گزری- جہدِ مسلسل، احترامِ انسانیت اور علم ودانش بانٹنے کا جذبہ دونوں ان کی شخصیت کے استعارے ہیں- پڑھنا، پڑھانا، سیکھنا اور سکھانا ان کی زندگی کا مقصد ہے- وہ بڑے آدمی ہیں لیکن وہ دوسروں کو چھوٹا کرکے بڑے نہیں ہوئے- وہ صاحب

محمد حبیب اللہ چشتی

بصیرت ہیں لیکن عجز وانکسار کا پیکر تمام۔
چند دن پہلے انھوں نے کمال شفقت فرماتے ہوئے مجھے اپنی تازہ تصنیف ''اجالے اپنی یادوں کے'' عنایت فرمائی۔
کتاب کو پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ کتاب رسمی طور پر نہیں لکھی گئی بل کہ ایک جذبۂ مقصدیت اس کا محرک بنا ہے۔ اس میں ماضی کی یادیں بھی محفوظ کی گئی ہیں لیکن اس سے بڑھ کر یہ ان کی جہدِ مسلسل کی داستان بھی ہے، جو اس راہ کے مسافروں کے لیے خضرِ راہ بھی ہے اور سنگِ میل بھی۔
بخاری صاحب وفاؤں کا استعارہ ہیں۔ ان کے جو دوست اس جہانِ فانی سے اللہ کے حضور پہنچ گئے ہیں، جو اپنے وقت میں تدریس کے مختلف شعبوں میں اپنی مثال آپ تھے، انھیں انفرادی اور معاشرتی طور پر چند دن تو یاد رکھا جاتا ہے لیکن بخاری صاحب نے اس کتاب میں ان پر جامع تبصروں سے ان کی یادوں کو ابدیت کا ایک رنگ دیا ہے۔ اسی نوعیت کا ایک مفصل کام پروفیسر جو محسن ملک صاحب نے بھی کیا ہے۔ اسی نوعیت کا ایک مفصل کام پروفیسر جاوید محسن ملک صاحب نے بھی کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان حضرات کو بہترین جزا دے۔
اس کتاب میں بخاری صاحب کی شفقتوں اور محبتوں کا تذکرہ ہے جو وہ اپنے طلبہ پر فرماتے تھے، جس سے طلبہ کے حوصلے بلند ہو جاتے۔ وہ شکستہ دل ہونے کے بجائے عزم و ہمت کا کوہِ گراں بن جاتے اور حصولِ علم کی منزل پر منزلیں طے کرتے جاتے۔ مثلاً ڈاکٹر فضلِ معبود کا تذکرہ پڑھیے، آپ کو یقین ہو جائے گا کہ بخاری صاحب گرانے والے نہیں بل کہ گرتوں کو تھامنے کے مقدس جذبات کے امین ہیں:

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

....

اس کتاب میں حرمین طیبین کی حاضری کا روح پرور اور ایمان افروز تذکرہ تو ایسے ہے جیسے پھول میں خوشبو اور جسم میں جان ہوتی ہے۔
اللہ تعالیٰ بخاری صاحب کو سلامت رکھے۔ ان کے جذبوں کو مزید وارفتگی نصیب فرمائے اور ان کے قلم کو مزید جولانیاں عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆

ریاض ندیم نیازی کی نعت کا فکری مطالعہ

ریاض ندیم نیازی بلوچستان کے علاقے سبی میں پیدا ہوئے۔ بلوچستان یونی ورسٹی کوئٹہ سے ایم اے صحافت کیا۔ سرکاری ملازم ہیں اور سبی میں ہی رہائش پذیر ہیں۔ علم و ادب کی خدمت گزاری میں اپنے قلم کو وقف کیے ہوئے ہیں۔ حمد و نعت میں ایک خاص پہچان رکھتے ہیں۔ میں نے اپنے اس مضمون میں اُن کی چار نعتیہ کتابوں [خوش بو تری جوئے کرم]، [ہوئے جو حاضر درِ نبی پہ]، [جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں] اور [چمن زار حمد و نعت] کے حوالے سے اُن کی نعت کا فکری مطالعہ کیا ہے۔

موصوف نے ہر موضوع کے ساتھ مکمل انصاف کیا ہے۔ اِن کی نعت کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ نعت لکھتے ہوئے خود کو ایک خاص ماحول میں رکھتے ہیں۔ ان کے دل و نظر کی دنیا نورانی جلووں سے آباد ہوتی ہے۔ یعنی وہ خود کو نعت کے لیے تیار کرتے ہیں۔ انھیں اس بات کا یقین ہے کہ وہ جو لکھ رہے ہیں وہ امر ہوگا اور یہی سچائی ہے۔ اس لیے وہ بڑے متوازن اور یقین بھرے لہجے میں نعت کہتے ہیں۔

میں اپنے مضمون کو اُن کی نعت تک لے جانے سے پہلے اُن کی حمد کے دو اشعار کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اشعار نہیں ہیں بلکہ اُن کا عقیدہ، ایمان اور نظریہ ہے اور یہی سوچ، جذبہ اور خیال نعت میں بھی موج زن ہے۔ وہ نعت کہتے ہوئے بھی شعر نہیں کہہ رہے ہوتے بلکہ اپنے دل کی بات کر رہے ہوتے ہیں۔

اُن کی حمد دیکھیں:

آشنائی ہو جو اُس کے نور سے
بند آنکھوں سے بھی دیکھا جائے گا
(چمن زار حمد و نعت، ص:66)

حمدِ باری میں ہے پوشیدہ بشر کا ارتقا
ہے اِسی میں جاں کا، دل کا اور نظر کا ارتقا
(چمن زار حمد و نعت، ص:254)

خدائے وحدہٗ لاشریک کے نور سے دیکھنے والے اور اُس کی حمد و ثنا میں دل و نظر اور

احسان اللہ طاہر

روحانی ارتقا کو جاننے اور سمجھنے والے خوب جانتے ہیں کہ حمد و نعت ہی وہ مقالہ ہے، حمد و نعت ہی وہ عبادت ہے جس میں ہم دوسروں کو شامل کر کے اپنے ماحول کو خوش گوار بنا سکتے ہیں، اپنے گھر کے در و دیوار کو مہکا سکتے ہیں اور موصوف کی حمد و نعت میں یہ ساری کوششیں اسی حوالے سے ہیں۔

ریاض ندیم نیازی کی نعت کے مضامین دل و نظر پہ اثر کرتے ہیں۔ وہ بڑی سادہ اور عام فہم بات کرتے ہیں۔ اُنھوں نے سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے موضوع کو اپنی نعت کی بنیاد میں رکھا ہے۔ وہ ذکرِ سیرتِ سرکار سے ہی کئی ضمنی مضامین نکال لاتے ہیں۔ اِس حوالے سے اِن کے اشعار اپنی سادگی کی وجہ سے منفرد دکھائی دینے لگتے ہیں۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو کرداری حوالے سے پیش کرتے ہیں۔

موصوف نے سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر عمل پیرا ہو کر زندگی گزارنے کو انسانی سوچ اور فکر و عمل کا ارتقا کہا ہے۔ وہ اِسی میں انسانی کردار اور اقدار کے ارتقا کی بات کرتے ہیں۔ اِن کی نعت اِسی حوالے سے معنی و مفہوم کے کئی نئے پہلوؤں اور زاویوں کو بیان کرتی ہے۔ اگر بنیادی حوالے سے دیکھا جائے تو جو شعرا سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں اُن کی نعت ہی یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ وہ نعت کو ذکرِ سیرتِ رسول ہی سمجھتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نعت فقط سراپا بیان کرنے کا نام نہیں بلکہ اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سلیقے سے بیان کرنے کا نام ہے۔ ریاض ندیم نیازی کا تعلق بھی ایسے شعرا سے ہے جنھوں نے پہلے سیرت کا مطالعہ کیا، پھر اُسے سمجھا اور اُس پر عمل پیرا ہو کر اِس عمل کو نعت کہا۔ یوں اِن کی نعت ایک اسی بنیادی نقطے کو لے کر اپنے موضوعات میں تنوع پیدا کرتی ہوئی نعت بنتی ہے۔ اگر ہم یوں کہیں کہ اِن کی نعت کے لفظوں میں جو اُجالا ہے وہ سب ذکرِ سیرتِ سرکار کے سبب ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ اِن کی گفتگو میں جو خوش بو ہے اُس کی بنیادی وجہ اِن کی سیرت سے عقیدت ہے:

جو عقیدت سیرتِ آقا سے رکھتے ہیں ندیم
جانتے ہیں کیسے کرتی ہے اُجالا گفتگو
(چمن زارِ حمد و نعت، ص: 271)

ہے یہ علم و فضل و فکر و آگہی کا راستہ
طاعتِ خیر البشر ہے روشنی کا راستہ
(ہوئے جو حاضر در نبی پر، ص: 57)

ریاض ندیم نیازی کی نعت کا دوسرا بڑا موضوع درود و سلام ہے۔ عہدِ حاضر کے نعت گو شعرا نے اب درود و سلام کو باقاعدہ صنفِ سخن کے طور پر لکھنا شروع کر دیا ہے اور اب تو ہر نعتیہ کتاب میں اسے باقاعدہ لکھا جا رہا ہے۔ جو لوگ اِسے الگ سے نہیں لکھ رہے اُن کی تقریباً ہر نعت میں کوئی نہ کوئی ایسا شعر ضرور نکل آتا

ہے جس میں درود وسلام کے ثمرات وانعامات اور وردِ درود وسلام کی برکتوں کا ذکر ہو۔ اِسے روحانی اور قلبی واردات کے حوالے سے بھی بیان کیا جاتا ہے۔ اصل میں وہ لوگ جو سیرتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہ گام زن ہوکر نعت لکھتے ہیں، اُن کو تخلیقِ نعت کی صورت میں جو جزا دکھائی دیتی ہے وہ اُسی روحانی کیف میں اپنی اِس جزا کا ذکر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی تخلیق کار اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گہرا مطالعہ بھی رکھتا ہو اور حکمِ [اطیعو اللہ و اطیعو الرسول] کو بھی مدِ نظر رکھ کر زندگی بسر کرنے کا جذبہ رکھتا ہو اور اِس کی نعت میں درود وسلام کا حوالہ نہ ملے۔

ریاض ندیم نیازی کی نعت میں درود وسلام کا حوالہ اُن کی نعت کو ایک نیا رنگ بخشتا ہے کیوں کہ اِس موضوع میں وہ روایتی پن سے کام نہیں لیتے۔ وہ اِس سچائی اور عمل کو مدِ نظر رکھ کر نعت کہتے ہیں جو کہ اُن کے دل میں ہے۔ اِس حوالے سے جیسے اُن کی نعت کے لفظ روشن ہیں ویسے ہی اُن کا اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رابطہ بھی روشن دکھائی دیتا ہے کہ وہ اِسی ذکر کو زندگی اور زندگی میں اِسی خیال کو بھولنے یا دل سے جانے کو موت کہتے ہیں۔ درود وسلام کے حوالے سے موصوف کے نعتیہ اشعار جہاں اُن کی اپنی دلی کیفیت کو بیان کرتے ہیں وہاں وہ ہمیں بھی اِس وجد آور کیف کی دنیا میں بسنے کی دعوت دیتے ہیں جہاں درود وسلام لبوں پہ سجائے لوگ جب بات کرتے ہیں تو اُن کی گفتگو میں اُجالے اترتے ہیں۔ اُن کے لفظ روشنی بن کر دلوں کو منور کرتے ہیں۔ روح کو تازگی بخشتے ہیں۔ انھوں نے بڑے لمبے چوڑے انداز اور خطیبانہ حوالے سے اپنی باتیں نہیں کیں بلکہ وہ جس اختصار سے بات کرتے ہیں موضوع اُسی حوالے سے مفصل ہوتا دکھائی دینے لگتا ہے۔ درود وسلام کے حوالے سے اُن کے کہے ہوئے اشعار میں شعریت اور تخلیق کا رنگ بھی نمایاں ہے۔

لب پہ ہے درود اُس کے ندیمؔ آنکھیں ہیں روشن
سر میں کوئی اَن مول سا سودا ہے یقیناً
(چمن زارِ حمد ونعت، ص:43)

دل ہی دل میں مستقل ہم پڑھتے رہتے ہیں درود
رابطہ رہتا ہے اپنا مصطفیٰ سے رات دن
(چمن زارِ حمد ونعت، ص:63)

پڑھیے درود مستقل، رکھیے خیال ہر گھڑی
اُن کا خیال زندگی، اُن کا خیال جائے کیوں
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:114)

جو بارگاہِ نبی میں آئے درود لے کر سلام لے کر
کریم نے پھر اُنھیں نوازا، کرم کے جلوے دکھا دکھا کر
(ہوئے جو حاضر درِ نبی پر، ص:49)

ریاض ندیم نیازی نے اپنے فکر وفن سے نعتوں کے جو دیے جلائے ہیں ان کی روشنی ان کے اندر اور باہر کو روشن کیے ہوئے ہے۔ اِن کا یقین ہے

کہ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عقیدت اور اطاعتِ خیر البشر وہ چراغ ہے جس سے دل ونظر تو منور ہوتے ہی ہیں، زندگی میں اُجالے تو آتے ہی ہیں مگر ان دیوں کی روشنی بعد مرنے کے لحد کو بھی روشن رکھتی ہے۔ ریاض ندیم نیازی کی نعت کا یہ پہلو بنیادی طور پر اُن کے اندر کا یقین ہے جو کہ لفظوں کا نور لے کر قاری کے دل ونظر کو منور کرتا ہے۔

اِن کی نعت میں یہ موضوع اُن کی ہر کتاب میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ تکرار سے بچنے کے لیے اِس کا انداز بدل کر اِسے یوں بیان کرتے ہیں کہ ہر بار اِس میں نیا فکری پن دکھائی دینے لگتا ہے۔ کبھی وہ نعت نگاری کو اپنی زندگی کا حوالہ کہہ کر اِسے محشر میں کامیابی وکامرانی کا وسیلہ لکھتے ہیں تو کبھی اِس حوالے کو قبر کا نور کہتے ہیں۔

یہ موضوع اگر ذاتی حوالے سے بھی دیکھا جائے تو اُن کی اِسی پاکیزہ محبت اور اطاعتِ رسولؐ کے جذبے کو دکھاتا ہے جو کہ ان سے نعت نگاری کروا رہا ہے۔ انھوں نے اِس جذبے کو نام دیے ہیں اور ہر نام سے یقین اور ان کے دل کی سچائی سنائی بھی دیتی ہے اور دکھائی بھی۔ انھوں نے جس انداز سے اِس احساس کو زبان دی ہے وہ نعت کا پہلو یوں بنتا ہے کہ اِس احساس اور یقین کو پختگی دینے والی بھی نعت ہی ہے اور وہ اطاعت اور عقیدت ہے جو کہ اِن کو اِس موضوع تک لے آئی ہے۔

زندگی کی ہر روشنی ختم ہونے والی ہے۔ ہر محبت کی روشنی، ہر پیار کا اجالا، ہر عقیدت کی ضیا مٹنے والی ہے کیوں کہ یہ سب عارضی اور وقتی روشنیاں ہیں۔ یہ سب دنیاوی اُجالے ہیں جن کی قدر وقیمت سانسوں کی آمد ورفت تک ہے۔ یہاں کی نسبتوں کا تعلق یہاں تک ہے مگر دامنِ کرم سے وابستگی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت وتعلق کی روشنی، درود وسلام کے سانسوں میں اُجالے، روح میں اترتی ہوئی عقیدت، آلِ نبیؐ وصحابہؓ کرام کی روشنی؛ قبر، برزخ اور محشر میں چھاؤں بن کر اترے گی۔ روشنی بن کر ہمارے نامۂ اعمال کو روشن رکھے گی۔ یہ وہ یقین اور ایمان ہے جو کہ ریاض ندیم نیازی نے اپنی نعت میں یوں بکھیرا ہے کہ قاری پڑھتے ہوئے خود کو اسی روشنی میں محسوس کرنے لگتا ہے۔

قبر میں بھی رہے روشنی آپ کی
زندگی کا صلہ اور کیا چاہیے
(خوش بوتری جوئے کرم، ص: 88)

چراغِ عشقِ محبوبِ خدا سے دل کرو روشن
یہی وہ روشنی ہے جس سے روشن قبر بھی ہوگی
(خوش بوتری جوئے کرم، ص: 96)

لَو لگا اُن سے گر چاہتا ہے ندیمؔ
اِک دیا قبر میں روشنی کے لیے
(ہوئے جو حاضر وربنیؐ پر، ص: 151)

نعتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہنا کسی نعمت سے کم نہیں اور جن کو یہ نعمت ملتی ہے وہ اس کی

خوب پذیرائی بھی کرتے ہیں۔ اگر بستی کے لوگ نعت کے صدقے نعت گو شعرا کی توقیر کرتے ہیں، اُن کی عزت کرتے ہیں اور احترام سے پیش آتے ہیں تو یہ اُن کی دُنیاوی کمائی ہے کیوں کہ نعت نگاری توفیقِ خداوندی ہے اور لوگوں کے دلوں میں احترام کا بیٹھ جانا بھی خدائے وحدہٗ لاشریک کا کرم نہیں تو کیا ہے۔ خدائے یکتا نے اپنے محبوب کے ذکر کو بلند کر دیا ہے اور اس کے دشمنوں کو ابتر کر دیا ہے۔ اب وہ لوگ جو کہ اپنے خدا کی توفیق سے اس کے ذکر کو دن رات پھیلا رہے ہیں تو خالق و مالک کا ایسے لوگوں پہ کرم و فضل ہے کہ وہ اُس رسولِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ذکر کر رہے ہیں کہ جن کا ذکر ہر آنے والے ہادی و نبی نے کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پہ جب دین کو مکمل کر دیا گیا تو بس پھر آپ ہی کا ذکر رہے گا۔ اگر اسی حوالے سے ریاض ندیم نیازی کی نعت کا مطالعہ کیا جائے تو وہ قبر کے حوالے کے بعد پہلے دنیا کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی نعت میں ایک مہکا ہُوا خیال پیش کرتے ہیں کہ مجھے تخلیقِ نعت نے اُن کی مدح و ثنا میں سرشار رکھ کر دنیا کے دوسرے دھندوں سے آزاد کر دیا ہے۔

عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وہ دیا ہے کہ ایک بار جس کے دل میں جل اُٹھے اُسی کی روح کو روحانی خوشی اور دولتِ سکوں سے سرشار کر دیتا ہے اور یہی روحانی خوشی اُسے تخلیقِ نعت پر آمادہ کار اور ہر دم تر و تازہ رکھتی ہے۔ ریاض ندیم نیازی کی نعت میں بھی یہی معاملہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ جو ہر دم تخلیقِ نعت پہ مائل دکھائی دیتے ہیں، دراصل وہ ان کے اندر کی روحانی خوشی ہے، وہ دولتِ بیدار ہے جس میں وہ ہر پل اضافہ چاہتے ہیں اور اس میں اضافہ تبھی ممکن ہے جب اس دولت کو بانٹا جائے اور یہ بانٹنا اُن کے نزدیک نعت کہہ کر اُسے پھیلانا ہی ہے۔ اس حوالے سے اگر اُن کی نعت کا مطالعہ کیا جائے تو اُن کا سکون اُن کے لفظ لفظ میں اُترتا ہُوا محسوس ہوگا۔ بنیادی طور پہ وہ اسی سکون کو، عقیدت اور طمانیت کو ذکرِ رسولِ خدا سے حاصل ہونے والی رونقِ دل و جاں کو نعت ہی کے ذریعے پھیلانا چاہتے ہیں اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ یوں اُن کی نعت فکری حوالے سے دو قدم آگے بڑھ کر عملی حوالے سے سماج میں اسی خوش بو کو پھیلاتی نظر آتی ہے۔

مجھے اس جہاں میں پہلے کوئی پوچھتا نہیں تھا
کہ ملی ہے جتنی عزت مجھے نعت سے ملی ہے
(چمن زارِ حمد و نعت، ص:77)

مجھے نعتِ نبیؐ سے کیا ملا ہے کیا بتاؤں میں
تصور کر نہیں سکتا کوئی میری کمائی کا
(چمن زارِ حمد و نعت، ص:253)

پوچھتے ہو کیا ہم سے، مدحِ شہ میں کیا پایا
دولتِ سکوں پائی، عشقِ مصطفیٰ پایا
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:39)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق و عقیدت رکھنے والے کے کردار کی پہلی اور بنیادی خوب صورتی اُس کا اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رنگ میں رنگے ہوئے ہونا ہے اور اسی کو وہ اللہ کا رنگ کہتے ہیں کہ جس سے اچھا رنگ اور کوئی نہیں ہے۔ اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرنے والوں کا پہلا پیار نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت و تعلق رکھنے والی چیزوں سے پیار ہے اور اس حوالے سے اردو نعت میں جو مقام دیارِ رسول کا ہے، آپ کے شہر کی گلیوں کا ہے وہ کسی اور جگہ کا نہیں ہے۔ اردو نعت میں مدینۃ الرسول کا ذکر کئی حوالوں سے ہوا ہے۔ خاص طور پہ گنبدِ خضرا کے حوالے سے مگر یہ ایک الگ موضوع ہے اور اردو نعت میں اِن دونوں موضوعات اردو نعت میں دیارِ رسول کا ذکر اور اردو نعت میں گنبدِ خضرا کا ذکر، مقالات و مضامین لکھے گئے ہیں۔ بعض شعرا نے مدینے کا ذکر اپنی ذاتی خواہشات کے حوالے سے، خاص طور پہ جس میں مدینے کی گلیوں میں جا بسنے اور وہاں کے ہو جانے کا روایتی ذکر ملتا ہے، کیا ہے۔ مگر ان کے ہاں تو احادیثِ رسول کا حوالہ بھی ہے اور نہایت عقیدت مندی اور پورے ہوش و حواس سے اُس دیارِ عشق کا ذکر ہے۔ ریاض ندیم نیازی کی نعت میں بھی مدینے کا ذکر روایتی حوالے سے آیا ہے مگر

انھوں نے مدینے کا ذکر کرتے ہوئے کسی دوسری خواہش کا اظہار نہیں کیا بل کہ ایک ہی جذبے، خیال اور احساس سے اِس موضوع میں رنگا رنگی پیدا کی ہے۔ ان کے ہر شعر میں ایک نیا جذبہ ایک ہی خواہش کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ان کا مدینے کو مدام دیکھنا اور ہمیشہ کے لیے وہاں جا بسنے کی تمنا ہی ان کے عشق اور دیارِ رسول سے عقیدت کی انتہا ہے۔ ان کی پہلی اور آخری خواہش اور آرزو ہی مدینہ ہے۔ اِس حوالے سے ان کے اشعار میں اِن کی عقیدت و محبت کے سارے زاویے واضح دکھائی دینے لگتے ہیں۔

سیرِ دنیا کی کہاں دل میں تمنا ہے ندیم
تا قیامت میں لگاتار مدینہ دیکھوں

(چمن زارِ حمد و نعت، ص:51)

اے کاتبِ تقدیر مدینہ ہی لکھا جائے
یعنی جو لکھی جائے مکرر مری قسمت

(چمن زارِ حمد و نعت، ص:147)

یہی آرزو تھی میری، یہی آرزو ہے میری
مرا مستقل ٹھکانہ وہی اِک دیار ہوتا

(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:51)

دیارِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوسرا حوالہ درِ رسول پہ حاضری ہے۔ ان لمحات کو ہمارے نعت گو شعرا نے کئی فکری زاویوں اور روحانی لذتوں سے بیان کیا ہے۔ اس لمحے کو لفظوں میں قید کر کے بیان کرنا یوں تو ناممکن ہے مگر جس سے اُس وقت جو ہو سکا

جو کسی کے دل پہ گزری اُس کو بیان کر دیا مگر اِس قلبی و ذاتی واردات میں نعت کا رنگ دیکھنا گنبدِ خضرا کی عظمتوں کو حوالہ بنا کر اپنی قسمت کے ستارے کو عروج پہ دیکھنا یہ بھی ریاض ندیم نیازی کا کمال ہے۔ اِس حوالے سے اِن کے دو اشعار دیکھیں:

رنگ ، خوش بو ، ضیا دیکھتے رہ گئے
روضۂ مصطفیٰؐ دیکھتے رہ گئے
میری بینائیاں عرش سے جا ملیں
دیدہ ور آئینہ دیکھتے رہ گئے
(خوش بو تری جوئے کرم، ص:138)

عدم سایۂ رسول کے فکری زاویے سے عقیدت اور عقیدے کے حوالے سے لکھی گئی نعت میں سائے کو محاوراتی حوالے سے شعرا نے بڑی معنوی وسعت دی ہے۔ گو کہ اِس میں اِن کا پہلا اور بنیادی خیال بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تھا اور اگر اِس بات کو خصائصِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ بات مکمل طور پر سچ دکھائی دیتی ہے کہ اللہ رب العزت نے آپ کو بنایا ہی سب سے افضل اور اعلیٰ ہے۔ عدم سایۂ رسول عربی فارسی اور اردو نعت میں شعرا نے کئی زاویوں سے فکری اور فلسفیانہ حوالوں سے بیان کیا ہے اور اِس میں ایسے خوب صورت اور اچھوتے مضامین نکالے ہیں کہ دل بار بار انھیں پڑھنے کو چاہتا ہے۔

ریاض ندیم نیازی نے بھی اِسی ایک لفظ سایہ کو دو معنوں میں تو کہیں محاورۃً بڑی خوب صورتی سے نبھایا ہے۔ انھوں نے اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہوئے اپنا عقیدہ بھی بتایا ہے اور اِس پہلو سے نیا معنوی انداز بھی تخلیق کیا ہے۔

یہ حقیقت ہے نہ سرکار کا سایا تھا ندیم
میں تو عالم میں فقط آپ کا سایا دیکھوں
(چمن زارِ حمد و نعت، ص:51)

کہتے ہیں سب حضور کا سایہ نہ تھا مگر
پھیلا ہُوا جو ہم پہ ہے ، سایہ حضور ہیں
(ہوئے جو حاضر در نبی پر، ص:107)

اِسی خاطر خدا نے تم کو بے سایہ کیا پیدا
نہ کرنا تھا جہاں میں اور کوئی دوسرا پیدا
(خوش بو تری جوئے کرم، ص:125)

ناموسِ رسالت و تحفظِ ختم نبوت کا موضوع اِس عہد میں ہماری نعت میں بنیادی اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے اور اگر گہری نظر سے نعتِ رسول کریم کا مطالعہ کیا جائے تو ہماری نعت کی اساس ہی عظمتِ رسول، ناموسِ رسالت، ذکرِ ختم نبوت اور اطاعتِ خیر البشر ہے۔ اب اِنھی موضوعات سے کئی ذیلی اور ضمنی مضامین نکلتے ہیں۔ حُرمتِ رسول کے حوالے سے جان قربان کرنے کا آغاز اُسی دن ہو گیا تھا جس دن دشمنانِ نبوت نے آپ کی زندگی میں اور آپ کے بعد جھوٹی

نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ تو جاں نثارانِ نبوت نے اپنے عمل سے یہ سچ کر دکھایا کہ شمعِ ہدایت کے پروانے جان دینے سے کبھی گھبراتے نہیں ہیں بل کہ اپنی جان قربان کر کے ہمیشہ کی زندگی پاتے ہیں۔ اُس دن سے آج تک مسلمانوں کی یہ زبان جس میں نعت لکھی گئی ہے یا لکھی جا رہی ہے ناموسِ رسالت پہ جان قربان کرنے کا ذکر بڑی شدت سے ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔

تیری ناموس پہ کر دیں گے نچھاور ہستی
شانِ آقا تری رحمت کی قسم ہے ہم کو
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:142)

ریاض ندیم نیازی کی ہر نعتیہ کتاب اپنے اندر تخلیقیت اور معنویت کے کئی نئے رنگ سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کی تخلیقِ نعت میں وہ جذبہ اور احساس بھی واضح دکھائی دینے لگتا ہے جو اُن سے نعت لکھواتا ہے۔ موضوعات کا تنوع اِن کے غور و فکر، مطالعۂ سیرت اور سہلِ ممتنع میں نعت لکھنا اِن کے فن کو تازگی بخشتے ہیں۔ یوں تو اِن کی ہر کتاب میں فن کے نئے زاویے دکھائی دیتے ہیں مگر غالب کی زمینوں میں کہی ہوئی نعت جو کہ [جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں] کے نام سے شایع ہوئی، اِس میں اِن کا فن کھُل کر سامنے آیا ہے۔ موصوف نے فنی حوالے سے غالب کے کچھ مصرعوں پہ یوں طرحی مصرعے کہے ہیں جیسے اُن کی تخلیقی توانائی اور فنِ نعت گوئی کے سارے رنگ اِن میں ڈھل گئے ہوں۔ انھوں نے مرزا غالب کے مشہور و معروف مصرعوں پہ طبع آزمائی کر کے اپنے آپ کو استاد نعت گو شعرا میں شامل کر لیا ہے۔

ریاض ندیم نیازی کے اِس مجموعۂ نعت [جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں] میں فکر و فن کے کئی نئے امکان دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں انھوں نے سادگی اور چھوٹی بحر میں غالب کی زمین میں لکھا ہے وہاں وہی رنگ اپنایا ہے جو کہ مرزا غالب کا ہے اور اِسی طرح دوسری زمینوں میں لکھتے ہوئے موصوف نے فن کا راستہ اپنایا ہے۔ اِس حوالے سے اِن کے اشعار کی کچھ مثالیں دیکھیں۔

سچ تو یہ ہے کہ محمدؐ کی غلامی کے بغیر
"آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا"
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:49)

وہ کہاں اور میری نعت کہاں
"حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:63)

از طفیلِ رحمتِ محبوبِ ربُّ العالمیں
"مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں"
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:110)

روضۂ مصطفیٰ پہ افسردہ
"کوئی صورت نظر نہیں آتی"
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص:153)

اِسی طرح موصوف نے کچھ مصرعوں میں تصرّف کیا ہے۔ تخلیقی حوالے سے اس

میں بہت خوب صورتی ہے۔ موصوف نے ایک خیال کو نعت کا جامہ یوں دیا ہے کہ نعت پڑھتے ہوئے تغزل کا مزہ بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔ بنیادی طور پہ ایسے تجربات ہی اردو نعت میں فنی اور فکری حوالے سے وسعت لا رہے ہیں۔ اِس حوالے سے ریاض ندیم نیازی کے دو اشعار دیکھیں:

مست ہو جاتا ہے عشقِ مصطفیٰ سے جس کا دِل
کھیل ہو جاتا ہے لانا اُس کو جوئے شیر کا

وہ مصیبت میں انھیں اپنا صدا دینا سدا
ٹوٹ جانا وہ ہمارے پاؤں کی زنجیر کا
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص: 37/33)

اردو نعت میں دیارِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بسنے کے حوالے سے شعرا نے جو نیا پن اختیار کیا ہے وہ اپنے شہر کا حوالہ ہے۔ اِس اعتبار سے اردو نعت کا مطالعہ ایک الگ مضمون کا مواد بھی رکھتا ہے۔ وہ لوگ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق و عقیدت رکھتے ہیں آپ کے شہر اور آپ سے نسبت رکھنے والی چیزوں سے پیار کرتے ہیں وہ اپنے وطن سے بھی اِسی لیے پیار کرتے ہیں کہ اپنے دیس اور دیار سے محبت بھی نعتِ رسول ہے۔ ریاض ندیم نیازی نے اِس حوالے سے بار بار اپنے شہر سبی کا ذکر کیا ہے مگر اُن کا مرکز و محور دیارِ رسول ہی ہے جس کا ذکر اِس مضمون میں اِس سے پہلے بھی ہو چکا ہے۔

میری کشتی کو کنارا چاہیے
میں ہوں سبی میں مدینہ چاہیے
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص: 17)

خواہش ہے کہ سبی سے چلا جاؤں مدینے
درکار ہے اب مجھ کو زماں اور مکاں اور
(جو آقا کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں، ص: 81)

کاش سبی سے مجھ کو لے جائے
میرے دل کی لگن مدینے میں
(خوش بو تریؒ جوئے کرم، ص: 173)

ریاض ندیم نیازی کی نعت میں اُن کی سادگی ہی اُن کی نعت میں تازگی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اِن کی نعت میں موضوعات کی وسعت اور سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطالعہ واضح دکھائی دیتا ہے جو ان کی نعت کو متوازن اور ٹھہرا ہوا لہجہ عطا کرتا ہے۔ وہ ہر مضمون کو بڑے دھیمے لہجے اور شاداب لہجے میں بیان کرتے ہیں۔ ان کی بات سیدھی دل میں اترتی ہے۔ انھوں نے صورت سے زیادہ کردار اور سیرتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نعت میں بیان کیا ہے۔ ریاض ندیم نیازی کا نام عہد حاضر کے بڑے نعت گو شعرا میں لکھا اور لیا جاتا ہے۔ آپ جس سلیقے سے مسلسل نعت لکھ رہے ہیں اور اِس میں جذبے اور خیال کا نیا پن لا رہے ہیں وہی اِن کی انفرادیت ہے۔

☆☆☆☆☆

سفرنامہ بطور تہذیبی بیانیہ: مظہر اقبال مظہر کی فکری بصیرت

مظہر اقبال مظہر لندن میں مقیم ہیں۔ یہ بیک وقت اردو، انگریزی میں لکھ رہے ہیں۔ بطور سفرنامہ نگار یہ اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ سفرنامہ کاغذی سرحدوں کے آر پار مظہر اقبال مظہر کا یہ سفرنامہ ایک دلچسپ اور معلوماتی ہے جو اُن کے یورپ کے سفر پر مبنی ہے۔ تین ممالک سوئزرلینڈ، فرانس اور اٹلی کے اہم مقامات سے قاری کو متعارف ہی نہیں کرواتے بل کہ چیدہ چیدہ پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ سفر مصنف نے اپنی اہلیہ اور بیٹی کے ہمراہ بذریعہ زمینی راستے کیا۔ جس نے اس سفر کو نہایت نجی، مشاہداتی اور قریب سے محسوس کیا گیا تجربہ بنا دیا۔

مصنف نے ہر مقام کو نہ صرف سیاحتی انداز سے بیان کیا بل کہ اس کے تاریخی، تہذیبی، اور تمدنی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا۔ ایفل ٹاور، پیرس کی گلیاں، جرمن دیہات، بیلجیئم کے عجائب گھر اور یورپ کی سڑکیں، ہر منظر کو انھوں نے اپنے مخصوص ادبی انداز میں پیش کیا۔ یہ سفرنامہ محض سیاحت کی روداد نہیں بل کہ تہذیبی مکالمہ ہے جس میں ایک مشرقی ذہن مغرب کی گلیوں میں جھانکتا ہے اور وہاں کی ترقی، صفائی، انسانی حقوق، تاریخ اور موجودہ زندگی کو پاکستانی یا مشرقی تناظر سے دیکھتا ہے۔

یہ کتاب پریس فار پیس فاؤنڈیشن نے شائع کی ہے اور اس میں عمدہ طباعت کے ساتھ ہر مقام کی تصویری جھلکیاں بھی شامل ہیں جو قاری کو سفر کی حقیقت سے روشناس کراتی ہیں۔

مصنف نے سفر کے دوران ہر مقام کی تاریخی، جغرافیائی اور ثقافتی اہمیت کو نہایت خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ مثلاً، پیرس میں ایفل ٹاور کی سیاحت کو "آئرن لیڈی کا جادو" کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے جبکہ

کومل شہزادی

نوٹرڈیم کیتھڈرل، مونٹمارٹ کا باسیلیکا، اور ایشین آرٹس میوزیم جیسے مقامات کی سیر کو بھی دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

مصنف کی تحریر میں ادبی چاشنی اور معلوماتی پہلو دونوں موجود ہیں جو قاری کو نہ صرف سفر کی روداد سناتے ہیں بل کہ تاریخی اور ثقافتی پس منظر سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔

مظہر اقبال مظہر کا اسلوب نہایت سلیس، رواں اور مشاہداتی ہے۔ ان کی نثر میں ادبی لطافت اور سچائی کی آمیزش ہے جو قاری کو ان کے ساتھ سفر پر لے جاتی ہے۔ کہیں وہ کسی تاریخی عمارت کے سحر میں گرفتار نظر آتے ہیں تو کہیں کسی یورپی قوم کی نفسیات پر غور کرتے ہیں۔

مصنف کی مشاہداتی آنکھ نہایت تیز ہے۔ وہ معمولی منظر یا واقعے میں بھی تاریخی و ثقافتی گہرائی تلاش کر لیتے ہیں۔ ان کا انداز سطحی سیاحت سے بالاتر ہے۔ وہ مغرب کی چکا چوند میں کھوئے بغیر اس کے سماجی تضادات کو بھی محسوس کرتے ہیں۔

کتاب میں بار بار مشرق اور مغرب کا موازنہ سامنے آتا ہے مگر یہ موازنہ تعصب پر مبنی نہیں بل کہ ایک باشعور مشاہدہ ہے۔ مصنف نہ صرف مغربی ترقی کو سراہتے ہیں بل کہ اپنے معاشرے کی کمیوں پر بھی نرم مگر واضح تنقید کرتے ہیں۔

مصنف کی زبان ادبی مگر بوجھل نہیں۔ وہ سہل الفاظ میں گہری بات کہنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ ان کے جملے قاری کو متاثر کرتے ہیں اور تحریر میں فنی جمالیات بھی جھلکتی ہیں۔ مصنف نے اپنے اہلِ خانہ اور سفر میں ملنے والے لوگوں کا ذکر بھی بڑی محبت اور نفسیاتی باریکی سے کیا ہے جس سے سفرنامہ صرف جگہوں کا تعارف نہیں رہتا بل کہ انسانی کہانی بھی بن جاتا ہے۔

المختصر، ''کاغذی سرحدوں کے آر پار'' صرف ایک سفرنامہ نہیں بلکہ تہذیبی مکالمے، ثقافتی مشاہدے اور فکری بصیرت کا بیان ہے۔ یہ ان قارئین کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے جو سیاحت کے ساتھ ساتھ تاریخ، ادب اور تہذیب کا شعور بھی رکھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

بدصورتی [افسانچہ]

لاہور کی ایک ادھ کھلی دوپہر تھی۔ دھوپ دھند میں لپٹی جیسے کسی خیال کی طرح مبہم ہو۔ شہر کے شور میں ایک عجب سا سکوت چھپا بیٹھا تھا، جو صرف وہی محسوس کر سکتا تھا جو دل کی دھڑکن سننے کے ساتھ ساتھ دیکھنے کی سکت بھی رکھتا ہو۔

مجھے لاہور آئے ابھی چند ہی گھنٹے ہوئے تھے کہ شہزاد اسلم راجہ نے حسبِ معمول میزبانی کا جھنڈا تھام لیا۔ وہ میرا پرانا یار تھا، لاہور میں اکثر قیام اسی کے ہاں ہوتا مگر آج وہ کچھ حیران تھا۔

"یار، تم ہر سال لاہور آتے ہو۔ کبھی داتا دربار جانے کی خواہش ظاہر نہیں کی، آج اچانک؟"
اس نے قدم سے قدم ملا کر پوچھا۔

میں نے نظریں نیچی رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا: "اس بار دل چاہا ہے، سوالی چہرے دیکھوں۔"

شہزاد اسلم نے ہونٹ بھینچ لیے اور کچھ کہے بغیر چلنے لگا۔ ہم بازارِ حسن سے گزرتے، داتا دربار کی سمت رواں تھے۔ دائیں بائیں، رکشے، گاڑیاں، سائیکلیں، اور انسانوں کا سیلاب تھا۔ سڑک کنارے فٹ پاتھوں پر زندگی اپنے برہنہ جسم سمیت لیٹی کراہ رہی تھی۔ فقیر، پاگل، بیمار، نشئی — سب چپ چاپ لیٹے تھے، جیسے یہ شہر ان کی موجودگی کا عادی ہو چکا ہو۔

ہم داتا دربار کے قریب پہنچے تو میں ایک چوراہے پر ذرا رکا۔ وہاں درجنوں کبوتر دانہ چگنے میں مصروف تھے، ان کے ساتھ دو تین انسان بھی لیٹے تھے، جن کی سانس اور زندگی

خالد نذیر

کی حد فاصل اب معدوم ہو چکی تھی۔

اسی اثنا میں ایک بدحال، نشے میں دھت بڑھیا کچرے کے ڈھیر سے نکلی۔ اس کے جسم پر ایک میلی سی چادر تھی جو بدن کو بمشکل ڈھانپ رہی تھی۔ وہ داتا دربار کے سامنے، ان ہی کبوتروں کے بیچ، سب کے سامنے شلوار اتار کر پیشاب کرنے بیٹھ گئی۔ منظر اس قدر وحشت ناک اور اذیت ناک تھا کہ میں چیخ مار کر سڑک پر ہی بیٹھ گیا۔

شہزاد، گھبرا کر پیچھے مڑا اور میری کلائی تھام کر زور سے کھینچنے لگا: ”پاگل ہو گئے ہو کیا؟ یہ سڑک ہے، مر جاؤ گے۔“

مگر میں جیسے کسی اور زمان و مکاں میں جا چکا تھا۔ میری نظریں اس بڑھیا پر تھیں۔ میرے لبوں سے بے اختیار نکلا:

”کیا یہی وہ عورت ہے جس کے وجود سے کائنات میں رنگ پیدا ہوتے ہیں؟“

شہزاد اسلم راجہ نے میری بات کو ناپسندیدگی سے رد کیا: ”چلو داتا صاحب کے پاس، تمہارا درد وہی دور کریں گے۔“

میں نے سر جھٹک کر کہا: ”میں آج وہی درد محسوس کر رہا ہوں جو گوتم بدھ نے راج محل سے نکل کر محسوس کیا تھا جب اس نے پہلی بار دکھ کی جھلک دیکھی تھی۔“

”بس کرو اپنی فلسفیانہ بکواس!“ شہزاد اسلم راجہ نے خفگی سے کہا۔

مگر میری دنیا بدل چکی تھی۔ میں اٹھا اور داتا دربار کی طرف جانے کے بجائے واپس مڑ گیا۔ شہزاد نے پیچھے سے آواز دی:

”ارے واپس کیوں جا رہے ہو، لوگ داتا دربار پر اپنی تکلیفیں لے کر جاتے ہیں، اور مرادیں پوری کر کے لوٹتے ہیں؟“

میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا:

”جانی! لوگ درباروں پر اس لیے جاتے ہیں کہ جس ملک میں انصاف کے ادارے سو جائیں، وہاں دربار جاگنے لگتے ہیں۔ میں وہاں دعا مانگنے نہیں جا رہا تھا، میں صرف چہرے دیکھنے جا رہا تھا — سوالی چہرے، دکھ بھرے چہرے، سسکیوں زدہ چہرے۔ اور قدرت نے سب کچھ دکھا اور کہہ دیا ہے صرف ایک بوڑھی عورت کی صورت میں۔“

”کیا دکھا دیا ہے اور کیا کہا ہے؟“ شہزاد نے پوچھا۔

میں نے گہری سانس لی، اور دکھ سے لبریز لہجے میں کہا:

”دنیا تیرا حسن، یہی بدصورتی ہے۔“

☆☆☆☆☆

پنیر کا ٹکڑا (ماگروف)

زندگی ہے یا پنیر کا ٹکڑا، جسے چوہوں نے جگہ جگہ سے کتر کتر کر، بے ڈھبا اور برباد کر دیا ہے --- نمکین، میٹھی اور ملائمت والی تو اب بھی ہے لیکن --- چوہوں نے ان مزوں کو چکھنے کے قابل نہیں چھوڑا --- اب پنیر کا یہ ٹکڑا ایک چینی کی ٹوٹی پلیٹ میں رکھ کر میں نے گھر کی دیوار پہ رکھ دیا ہے جہاں کوے، چڑیاں، لالیاں چیلیں، بلیاں آتی ہے اور دھوپ بھی خوب آتی ہے --- میرے اندر پنیر کے ختم ہونے کے تمام امکانات اور اس کے تمام مراحل دیکھنے کا حوصلہ موجود ہے، اس لیے میں نے بھی آج شام تک اس کے سامنے اپنی چھوٹی میز، کرسی رکھ لی ہے اور میچنگ کا سامان بھی رکھ لیا ہے، آج کا سورج غروب ہونے تک تو یہیں پنیر پہ نظریں جمائے رکھوں گی -----

دھوپ نے پنیر کو دھیرے دھیرے اسی طرح پر پگھلانا شروع کر دیا ہے کہ جیسے تپتی دوپہر میں کوئی راہگیر لو لگنے سے اچانک سڑک پہ بے دم ہو کر گر پڑے اور تادیر اس کو اٹھا کر ہسپتال لے جانے والا کوئی نہ آئے۔ پنیر کے تیز چاروں نے اپنی ہیئت کھو چکے تھے۔ اور اب کے پہلے ایک چھوٹی سی چڑیا آئی اور اپنی چونچ سے پنیر کے ٹکڑے پہ سوراخ کر کے چل دی۔ پھر لالی آئی اس نے پنیر کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی یوں نوچی کہ جیسے کسی کے جسم سے بوٹی نوچی جاتی ہے اور وہ لالی اس ٹکڑی کو چباتے چباتے درخت کی جانب اڑ گئی۔ پھر کوے نے پنیر دیکھی اور اپنے قبیلے کو جب تک بلا نہیں لیا، اس نے پنیر کو کھانے والی نظر سے نہیں دیکھا اور جب اس کی قبیل کے کوے آگئے، تو سب مل کر پنیر پہ پل پڑے اور اسی پکڑ دھکڑ میں جس کے حصے جتنی پنیر آئی، اسے کھینچ تان کر، چونچ میں بھر کر بڑے سے درخت کے بڑے بڑے پتوں کے اندر کہیں چھپ کر بیٹھ کے کھانے لگے --- اس منظر کو بلی نے بہت ہی صبر سے اور منہ میں پانی بھر بھر کر دیکھا --- مگر کووں کے غول سے ڈری سہمی فاصلے پر چاروں پیروں پہ سمٹی سمٹائی بیٹھی رہی۔ اس سے پہلے کہ وہ بچ جانے والی پنیر کو جا لیتی ایک چیل اپنے جہازی سائز پر پھیلائے پنیر پہ جھپٹی اور پنیر کا ٹکڑا اٹھا کر لے گئی، کووں، چڑیوں اور لالیوں سے کہیں بلند ہوا میں تیرتی رہی پنیر کی ملائمت کے مزے اٹھاتی رہی اور اسکے نیچے، بہت نیچے رہ جانے والی دیوار پہ چپکی بچی کھچی پنیر کو بزدل بلی بھی چاٹنے میں مصروف تھی ----

سورج کو غروب ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے اور وہ اپنی رفتار سے ڈوبنے کی طرف بڑھ رہا تھا اس بات سے بے خبر کہ اس کا حسن و جمال کسی ملائم کی جان لے گیا ہے -----

☆☆☆☆☆

بشریٰ شیریں

مہربانو کا نوحہ

آج کا پورا دن اداسی کی دبیز دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ طبیعت میں ایسی کسل مندی تھی کہ کچھ کرنے کو جی ہی نہ چاہا تھا۔ کرب کی اک لہر تھی جو مہربانو کے تن من کو بھگو رہی تھی۔ وہ خود اپنی اس کیفیت کو سمجھنے سے قاصر تھی حالانکہ ---

اسے کوئی فکر تھی نہ پریشانی بلکہ آج کا دن تو مبارک سلامت کے شور میں ہی گزر رہا تھا۔ فیس بک، وٹس ایپ، میسنجر، انسٹا گرام سب طرف ڈھیروں پیغامات گردش کر رہے تھے ۔ دوست احباب، کولیگز، رشتہ دار سب ہی مبارک بادیں بھیج رہے تھے اور اسے یہ سب میسج دیکھتے ہوئے صبح سے شام ہو گئی تھی۔ زندگی میں محبتوں کا یہ بھی ایک انوکھا روپ تھا۔

کہیں رنگا رنگ تصویریں تھیں اور کہیں دل گداز تحریریں!

کہیں مختلف ذائقوں کے کیک تھے اور کہیں پھولوں کے انبار مگر---

یہ سب کچھ ہوا کے دوش پر ہی تھا کہ نہ تو ابھی تک تازہ پھولوں کی مہک نے اسے سرشار کیا تھا اور نہ ہی کسی برانڈڈ کیک کا ذائقہ اس کے لب و دہن کو شہد آگیں کر پایا تھا۔

وہ بھی صبح سے کہیں گئی تھی اور نہ ہی کوئی اسے ملنے آیا تھا۔

وہ جاتی بھی تو کہاں؟

کہ جس کا دن منایا جا رہا تھا وہ تو کب کی دنیا چھوڑ چکی تھی۔ مہربانو کا دل بھر آیا!

کاش بی بی جان زندہ ہوتیں تو میں انھیں مبارک باد دینے جاتی یا پھر انھیں کوئی تحفہ بھیجتی۔

اس نے سوچا! جب بی بی جان زندہ تھیں

تسنیم کوثر

تب یہ دن منانے کا رواج شروع نہیں ہوا تھا۔ ان دنوں مبارکبادی کا شور مچتا تھا اور نہ ہی تحائف کی رسم نبھائی جاتی تھی۔ ہمارے بچپن میں تو بس سیدھا سادہ پیار ہوا کرتا تھا۔ ہم بہن بھائی بی بی جان سے پیار کرتے تھے اور بدلے میں ان سے پیار ہی وصولتے تھے۔ جب ہمیں ڈانٹ پڑتی تھی تو ہم وہ بھی ہنس کر سہہ لیتے تھے کہ ہمارے زمانے میں ڈانٹ ڈپٹ سے بچوں کی خود اعتمادی مجروح نہیں ہوتی تھی۔ رشتوں میں قربت اور جذبوں میں حلاوت نے زندگی کو خوب صورت بنا رکھا تھا۔ رشتے دار ملتے جلتے تھے۔ دستر خوان سجائے جاتے تھے۔ سب ایک جگہ اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ نہ مہمانوں کو اپنے مہمان ہونے کا زعم ہوتا تھا اور نہ میزبان آنے والوں کو بوجھ سمجھتے تھے۔ تب ڈونگوں، ڈشوں میں کھانا سجانے کا رواج تھا اور نہ ہی چائنیز کھانوں کا۔ سیدھے سادے روایتی کھانے پکتے تھے اور پلیٹوں میں فرداً فرداً برتا دیے جاتے تھے۔ بی بی جان ہم ڈھیر سارے بہن بھائیوں کو سنبھالتی تھیں۔ ہر بچے پہ کڑی نظر رکھتی تھیں۔ سونے کا نوالہ کھلا کر شیر کی نظر سے دیکھتی تھیں اور ہم سب بچے بی بی جان کی ہر بات پہ لبیک کہتے جاتے تھے کہ یہی ہماری تہذیب تھی اور یہی ہماری تربیت مگر۔۔۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ بدل گیا۔ ہم لوگ تہذیب یافتہ ہو گئے۔ ہمارے سونے جاگنے، کھانے پینے کے انداز اور اوقات ہی بدل گئے۔ دستر خوان لگانے کا رواج ختم ہو گیا۔ ایک ہی گھر میں رہنے والے کھانے کی میز پر بھی الگ الگ کھانا کھانے لگے۔ اب تو سب کی اپنی اپنی دنیا ہے۔ زندگی کی مصروفیت اور سوشل میڈیا کی سہولیات نے ہر شخص کو الجھا رکھا ہے۔ جانے انجانے لوگوں سے میل ملاپ بڑھا لیا گیا ہے مگر ساتھ والوں کی کوئی خیر خبر نہیں۔ اب تو ہر اچھی بری خبر فیس بک کی بدولت منٹوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ پہلے لوگ اپنی تفریحات، گھر کی باتوں کی یوں سرعام کب نمائش کرتے تھے مگر اب تو یہ حال ہے کہ سیر و تفریح، شادی بیاہ، ناچ گانا سب کا تصویری منظر نامہ بنا کر سوشل میڈیا کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔

مہربانو کو یاد آیا:

وہ اپنے سکول کالج کے زمانے میں تقریبات میں شرکت کے لیے جاتی تھی تو بی بی جان جھٹ سے اسے ایک ہی نصیحت کرتی تھیں۔

دیکھو مہرو! کیمرے سے دور ہی رہنا اور اگر بصد اصرار سب سہیلیاں کہیں بھی تو گروپ میں فوٹو بنوانا۔ جانے کیا خدشہ تھا بی بی جان کو جو کبھی کیمرے کا سامنا ہی نہ کرنے دیتی تھیں۔ بی بی جان نے کیمرے کا ایسا ڈر بٹھا دیا تھا کہ وہ تو اپنی شادی پر بھی تصویری پوز نہ بنا سکی تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ بچپن کے خوف عمر بھر ہم عورتوں کا پیچھا کرتے ہیں۔

مہربانو ماضی کی سوچوں میں غلطاں تھی کہ تمکنت کا فون آ گیا۔

Happy Mothers Day Maa!

Piyari Maa Miss you

کیسی ہیں میری پیاری ماں؟ وہ لاڈ جتانے لگی۔

تمکنت کی کھنکتی ہوئی آواز سن کے مہربانو کی ممتا جوش مارنے لگی اور آنسو بہہ نکلنے کو مچلنے لگے۔ اسے شدت سے اپنی بیٹی یاد آنے لگی۔

تمکنت اس کی پہلوٹھی کی اولاد تھی۔ اس کے باغ میں کھلنے والی پہلی کلی۔ وہ پھر ماضی کے ورق پلٹنے لگی۔

جب تمکنت چھوٹی تھی تو کتنے لاڈ اٹھائے تھے میں نے اس کے۔ میں نے تو اس کے وہ سارے شوق بھی پورے کیے تھے جو بی بی جان نے مجھے کبھی کرنے ہی نہیں دیے تھے،

مہربانو نے سوچا۔

میں نے تو اپنی لاڈلی بیٹی کو ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا تھا۔ میں جانتی تھی کہ شوق کی یہی عمر ہوتی ہے۔ پھر تو زندگی کی ذمہ داریاں اور الجھنیں یوں گھیر لیتی ہیں کہ کچھ ہوش ہی نہیں رہتا۔ میں نے تو اپنی نوکری کی تھکن بھی کبھی اپنی بیٹی پہ حاوی نہیں ہونے دی تھی۔ رج رج اسے شاپنگ کرواتی تھی۔ میلوں ٹھیلوں پہ رونق دکھانے لے جاتی تھی۔ تمکنت کو سینما دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا دل رکھنے کو اس کا ساتھ دیا کرتی تھی۔ ہارون صاحب اکثر مجھے منع بھی کرتے تھے مگر اولاد کے لیے میں نے کبھی دل تنگ نہیں کیا تھا لیکن اتنے لاڈ پیار کے باوجود بیٹی کی تربیت میں نے بی بی جان کی طرح ہی کی تھی۔ ادب لحاظ قائم رکھا تھا۔

اب تو ماں باپ بچوں کے دوست بن گئے ہیں اور دوستی میں ادب لحاظ کہیں پیچھے رہ جاتا ہے۔

اب تمکنت اپنے بچوں میں گھری ہوئی تھی۔ گھرداری سنبھالے ہوئے تھی۔ لمبا چوڑا سسرال تھا۔ سب کاموں سے نمٹ کے اسے فرصت ملی تو اس نے ماں کو یاد کیا۔

مہربانو کے دل سے اک ہوک اٹھی!

کہ آج کے دن بھی میری بیٹی کو ماں سے

ملنے کی فرصت نہیں مگر وہ دل میں اٹھتی کرب کی لہروں پہ قابو پاتی ہوئی تمکنت سے باتیں کرتی رہی۔ تمکنت اسے اپنی بیٹی کے بارے میں بتا کے نہال ہوتی رہی۔

پیاری ماں! یہ ردا نے میرے لیے گریٹنگ کارڈ بنایا ہے۔ مجھے اس نے مدرز ڈے وش کیا ہے۔

تمکنت سے باتیں کرتے ہوئے مہربانو کا دل بھر آیا تھا۔ بیٹی کی یاد اسے ستانے لگی۔ اک بے نام اداسی من کو کھانے لگی۔ اس اداسی کو بھگانے کے لیے وہ اٹھی اور کچن میں اپنے لیے کافی بنانے چل دی۔ کافی بنا کر جیسے ہی وہ ٹی وی لاونج میں آئی اور پہلا گھونٹ بھرا کہ اتنے میں اس کی ملازمہ ہاجرہ آ گئی۔ ہاجرہ اکثر شام کو اس کے برتن دھونے آیا کرتی تھی۔

ہاجرہ نے آتے ہی چوڑیوں سے بھری اپنی سانولی کلائیاں مہربانو کے سامنے کر دیں۔

دیکھیں بی بی جی۔ وہ اٹھلائی۔

ارے واہ! مہربانو نے تعریف کی۔ بہت خوب صورت چوڑیاں ہیں ہاجرہ۔ کس خوشی میں پہن لیں آج اتنی ڈھیر ساری چوڑیاں؟

ہاجرہ بڑے چاؤ سے بولی ایں بی بی جی یہ میرا بیٹا اللہ رکھا لے کر آیا ہے۔ کہتا ہے امی! آج ماؤں کا دن ہے۔ میں تیرے لیے تحفہ لے کر آیا ہوں۔

ہاجرہ کے ان جملوں نے مہربانو کے دل میں درد کا طوفان اٹھا دیا۔ اسے ہاجرہ کی خوش نصیبی پہ رشک آنے لگا۔ غربت کے سمندر میں غوطے کھانے کے باوجود اس کے بیٹے کو ماں کی خوشی یاد تھی۔ مہربانو نے آنسوؤں کے طوفان کو پلکوں کے پیچھے دھکیلا اور ضبط کا دامن تھام کے اپنے پرس میں سے کچھ پیسے نکالے اور ہاجرہ کی مٹھی میں دے دیے۔

ہاجرہ کسمسائی! ارہنے دیں بی بی جی۔

رکھ لو ہاجرہ۔ بیٹے نے تمہیں چوڑیوں کا تحفہ دیا۔ تم بھی گھر مٹھائی لیتے جانا اور اس کا منہ میٹھا کروا دینا۔ محبتوں کا سفر رکنا نہیں چاہیے۔

یہ کہتے ہوئے مہربانو کے من میں محرومی کی چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ اپنے رشتوں کی بے حسی نے اسے روہانسا کر دیا۔ ہاجرہ چلی گئی تو مہربانو بلک بلک کر رونے لگی مگر---

یہ آنسو حسد کے آنسو ہرگز نہ تھے۔ یہ آنسو تو مامون اور ہارون کی بے اعتنائی کے تھے کہ گھر میں اس کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی دونوں باپ بیٹا تحفہ دینا تو دور کی بات اسے اس دن کی مبارک باد بھی نہ دے سکے تھے---

☆☆☆☆☆

بھاڑی

دوستی کا چالیسواں ایک نرالا سا خیال تھا۔ مگر حمید کے خیالات ہمیشہ سے ان ہونے رہے۔ وہ اکثر دوستوں کو نصیحت نما وصیت کیا کرتا کہ اس کا دماغ آئین سٹائین کی طرح محفوظ کرلیا جائے کہ آخر وہ اس قدر عقل مند کیوں ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا کہ خدا نے رزق کا وعدہ کر رکھا ہے۔ دلیری، حسن، اور عقل ایک خاص انعام ہے جو وہ اپنے پسندیدہ بندوں کو عطا فرماتا ہے۔ اس نے ہی بتایا کہ عبرانیوں میں تکمیل کا عدد چالیس ہے۔ جبکہ عربوں میں ستر۔

"جب ہم سکول میں داخل ہوئے، چھتے منے بچے تھے۔ زندگی کا سفر طے کرتے اب چالیس برس ہونے کو ہیں تو ضروری ہے دوستی کا چالیسواں منایا جائے"

یوں تو باقی چاروں دوست بھی مالی طور پر اچھے تھے۔ مگر حمید کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ اس پہ قسمت کی دیوی مہربان تھی۔ ہر اک کاروبار کامیاب رہتا۔ محبت میں بھی کراچی کوچ کی طرح منزلیں مارتا بڑھتا ہی رہا جبکہ باقی چاروں کو بڑے بڑے نقصانات برداشت کرنا پڑے۔

اعجاز کالج میں ہی تھا کہ ایک جبس زدہ سہ پہر میں اس کا پڑوسی درے کا بنا پستول لیے چلا آیا۔ والد سے بیٹھک میں طویل گفتگو رہی وہ رہنمائی لینے آیا تھا کہ اعجاز کو قتل کرے یا اپنی بیٹی کو یا خود پہ گولی چلائے۔ چونکہ خودکشی حرام ہے، بہتر ہی ہوتا کہ اعجاز کے والد اس پہ گولی چلاتے۔ طویل بحث کے بعد دبی دبی زبان اور شستہ لہجے میں گفتگو رہی۔

پڑوسی نے بغیر لائسنس پستول جیب میں ڈالا اور سر جھکائے چلا گیا۔ عجلت میں چند ایک رشتہ دار بلوائے۔ منحنی سا نکاح خوان ساتھ لے کر شام میں نکاح پڑھوا کر بہو گھر لے آئے۔ بیرون ملک تعلیم کے لیے جانا اور امریکی گرین کارڈ لینے کے سپنے خاک میں مل گئے۔ منا بھی چند ہی ماہ میں قندھاری بازار کے رکشے کی طرح مارتا کاٹتا راہ بناتا زندگی میں چلا آیا۔ شبیر نے والد کے بعد کاروبار سنبھالا تو راجہ اندر کی اپسرائیں چادری پہنے شاپنگ کے لیے آتیں۔ حسینائیں محمود غزنوی کی طرح تواتر سے

آغا گل

حملے کرتیں اور مال غنیمت سمیٹ کر اگلے حملے کے لیے پر تولنے لگتیں۔ اتنے میں شہر بھر کے دل کی دھڑکن مشہور رقاصہ اس سے محبت کرنے لگی اس نے نذرانے لینے بھی بند کر دیے کہ شبیر اب تماش بین نہیں بل کہ اس کا محبوب ہے۔ اسے پال پوس کے بڑا کرنے والی موسیقی رقص کی ترتیب دینے والی نائیکہ نے بھاؤ تاؤ کیا کہ حسین ہونے کے سبب مہنگی بکتی آئی تھی۔ صرف اس پہ خرچ اس قدر ہوا۔ سونے کی چڑیا کی قیمت تو ادا کر دے۔ نہ سہی منافع! ایک دکان اور دو بنگلے سودے میں گئے۔ مگر شبیر کو فخر تھا کہ ہیلن والے پیرس کے بعد وہ ہی سب سے بڑا عاشق ہے۔

شبیر نے دل کی دھڑکن پر دولت کے علاوہ ایک دکان اور دو بنگلے نچھاور کر دیے۔ سبھی دوست عورت گزیدہ تھے۔ گرگ باراں دیدہ تھے۔ مگر حمید واردات قلبی سے محفوظ رہا۔ حالانکہ تھا وہ بھی رہ حافظ اور خیمہ خیام کا مکین۔ اس کے یوں زندہ بچ نکلنے پر دوستوں کو حیرت بل کہ قدرے حسد بھی ہوتا کہ کیا ٹھاٹھ کی زندگی گزار رہا ہے۔ وہ یہ راز جاننا چاہتے تھے۔ ضروری تھا کہ حمید ٹن ہو اور سچ بولے۔ طے پایا تھا کہ جو بھی ساقی گیری کرے۔ حمید کے پیگ بہت ہی تیز بنائے جو ہوتو اسی مقدار کے مگر سوڈا، پانی یا جوس نسبتاً کم ڈالے۔ تاکہ سب سے پہلے ناک آؤٹ ہو جائے۔

رفیق بھی دل جلا تھا۔ وہ بھی بھید جاننا چاہتا تھا۔ بیکل ہوا جاتا تھا۔ کاروبار کے علاوہ اسے ہیرو بننے کا شوق بھی تھا۔ ملک کا مشہور ہیرو بننا ایک خواب تھا۔ راہ ہموار کرنے کے لیے ٹی وی اسٹیشن جایا کرتا۔ پروڈیوسروں کی خدمت کرتا۔ جو کسی طوائف کی مانند تحائف نذرانوں پہ ہی کیواڑ کھولتے مگر اس قدر مال لگانے کے باوجود کسی ڈاکو، پولیس والے یا اٹھائی گیر کا ہی کردار ملا کرتا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ امریش پوری سے خدوخال ملتے ہیں۔ بطور ولن کے زیادہ کامیاب رہے گا۔ ڈرامے میں ایک آرٹسٹ ٹکرا گئی۔ پیکر حسن و جمال تھی۔ چغتائی آرٹ کا مرقع۔

دوستوں نے مشورہ دیا کہ قافلہ عشاق میں چلتا رہے، جیسے کراچی پہنچنے کے لیے کوئی سدا بہار کوچ تو نہیں خریدتا۔ بس کرایہ بھاڑا بھر کے چڑھ جاتا ہے۔ مگر رفیق سخت Possessive تھا۔ وہ سالم بکرے کی طرح سالم لڑکی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لڑکی بھی سے وہ ایک تیار دتی لینے والوں میں سے نہ تھا۔ لڑکی خاصی منجھی ہوئی تھی۔ اس نے رفیق سے کہا کہ اسے چاہنے والے تو ایف سی چیک پوسٹوں سے بھی زیادہ ہیں۔ جب رفیق محبت میں ٹھوک بجا کر دیکھنے کا

قائل ہے تو وہ بھی شہزادی مہر نگار کی طرح رفیق کی محبت کا امتحان لے گی۔ دوستوں نے سمجھایا کہ سالم تانگے کی طرح سالم محبوبہ کا فیشن بھی ختم ہو چکا ہے۔ مہنگائی کے باعث دو تین دوست مل کر ہی آسٹریلین گائے کی طرح ایک محبوبہ پالتے ہیں۔ رہا امتحان تو پرانے عشاق کو بھی کوئی جادوگر خاص تلوار، اڑنے والا گھوڑا دیا کرتا۔ لیکن رفیق عاشق صادق تھا۔ بخوشی عاقل خان کی طرح دیگ میں فل بوائل ہونے کو تیار تھا۔ ہیروئن نے کوئی تحریری یا زبانی امتحان نہ لیا۔ بس اتنا کہا کہ اگر اپنے حصے کی پراپرٹی اس کے نام کر دے تا کہ اسے یقین آئے کہ جان دینے والا جناح روڈ کی دکان اور ڈیفنس کا بنگلہ بھی دے سکتا ہے؟ یوں بھی شادی کر کے وہ رفیق کی بیوی بن کر رہے گی۔ وہ اور اس کے زیور جائیداد سبھی کچھ تو رفیق کی رہے گی۔ دوستوں نے بھی منع کیا مگر وہ پروانہ خاکستر ہونے کے لیے تیار تھا۔ پراپرٹی کی ٹرانسفر پہ دستخط ہوئے تو ہیروئن نے بھی نکاح نامہ پر دستخط کر دیے۔ خوشی کے چند ہی روز گزرے ہوں گے کہ رفیق کو شبہ ہونے لگا کہ اغیار کے کاشانوں پہ رحمتیں اور چشمہ فیض جاری ہے۔ عورت کوئی ایرانی سرحد نہیں ہوتی کہ خاردار تاروں سے بند کر دی جائے۔ نہ ہی پیر میں رسی لگا کے کسی کھونٹے سے باندھی جا سکتی ہے۔

بات تو تو میں میں تک جا پہنچی۔ ہیروئن میرا جسم میری مرضی تحریک کی جذباتی لیڈر بھی تھی۔ اس نے جواب دے دیا کہ بیوی ہو کر بھی اسے Space چاہیے۔ رفیق کو لگا وہ Paying Guest بنتا جا رہا ہے۔

بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ غیرت کے نام پر قتل کرنے والوں میں شامل ہو کر مرد ہونے کا ثبوت دے۔ جبکہ دوستوں کا اصرار تھا۔ کہ طلاق دے کر لاتعلق ہو جائے۔ مگر طلاق سے تو جائیداد بھی ہیروئن ہی لے جاتی۔ رفیق چاہتا تھا کہ ہیروئن بھی محبت کے ڈرامے کی Anti Climax ٹریجڈی میں ڈوب جائے۔ چند ہی روز بعد کسی ڈاکو نے ہیروئن کو مار ڈالا۔ رفیق فاتحہ لیتا، آنسو بہاتا چہلم سے پہلے ہی پکڑا گیا۔ فرانزک رپورٹ سے پتہ چلا کہ وہی قاتل ہے۔ جیل والے اسے کبھی کسی کھولی میں بند کر دیتے کبھی کسی چکی میں۔ مال ملتا تو ترت ہسپتال وارڈ میں آرام دہ بستر پہ لٹا دیتے۔ سوچتے بھی کھائے سو پیاز بھی۔ جائیداد بھی گئی۔ اور خون بہا میں ہاتھ سے سارا ہی پیسہ نکل گیا۔

جیل سے باہر آ کر اس نے ٹی وی سے توبہ

کی اور اپنے بچے کھچے پیسے لے کر عام سا کاروبار کرنے لگا۔ بھائی بھی خفا تھے کہ پیرس کی طرح جیلن کی محبت میں کمبخت نے ان کا پورا ٹرائے ہی مسمار کر دیا۔ وہ بھی مالی امداد دینے سے کتراتے کبھی مالی مدد مانگتا تو ٹھٹھوں میں اڑا دیتے۔

نوید بھی ایک حسینہ کے ہاتھوں مارا گیا، جس کا شوہر تھا تو امیر مگر دیا گرا پھانکنے کے باوجود اس کے کتے فیل ہو چکے تھے۔ مردوں کے Poodle مردوں طرح ترنم سے بھونک سکتا تھا۔ بھنبھوڑنے کاٹنے چبانے کی طاقت نہ تھی۔

ایک رومانی رات میں جبکہ موسیقی تھی، حسن تھا، شیفتگی تھی اس کے شوہر کی تیز وسکی فرط جذبات میں زیادہ ہی چڑھا چکا تھا۔ جانے رات گئے شوہر کیسے خلاف توقع ٹپک پڑا۔ اس کی کار کے ہارن کی آواز سیکورٹی گارڈ کا گیٹ کھولنا۔ ایک ایک لمحہ قیامت کا تھا۔ جو اسے محبت کی قسمیں دے کر بہ اصرار بلایا کرتی۔ اب اسے اندھیرے میں کھڑکی سے باہر کود جانے پہ مجبور کر رہی تھی۔ نوید کا خیال تھا کہ اگر وہ کھڑکی سے لٹک جائے تو سات فٹ بن جائیں گے۔ باقی رہے تین فٹ یا ایک گز وہ تو کوئی بات نہیں یہ بات البتہ اس کی محبوبہ جانتی تھی کہ کھڑکی چٹانوں پہ کھلتی فاصلہ بیس فٹ سے کم نہیں ہوگا۔ نوید الوداعی بوسہ لے کر لٹک کر باہر کود گیا۔

اگلی صبح کسی مالدار نے بھیڑ بکریاں چراتے خون میں تر بتر پردیسی دیکھا تو جھٹ لیویز کو اطلاع دی۔ نوید کی آنکھ چند روز بعد ہسپتال میں کھلی تو وہ ایک ٹانگ اور بازو کی محبت میں قربانی دے چکا تھا۔ دایاں ہاتھ مفلوج ہو چکا تھا۔ ٹانگ بھی کسی سیاسی حکومت کی طرح کام نہ کرتی۔ بس گھسٹتی رہتی، دوسری ٹانگ کی بیساکھی بنی رہتی اپاہج ہونے کے باعث محبت کے ارینا سے باہر دھکیلا گیا۔ کاروبار زندگی سنبھالنا بھی دشوار ہوا۔

لوگ مدعو ہونے پہ دریافت کیا کرتے۔ ”دعوت ہے یا کہ خیرات“ اس کا مطلب تھا کہ اگر ڈرنک نہیں ہے صرف کھانا ہی ہے تو سوئم یا چہلم کی نیاز خیرات ہوئی۔ جبکہ دعوت میں تو ڈرنک ہوا کرتی ہے۔ اس لیے حمید نے پہلے ہی مطلع کر دیا تھا کہ دوستی کے چالیسواں پہ دعوت ہوگی۔ جس کے باعث دوست خوش تھے کہ کسی نہ کسی طرح کرید کرید کر حمید کی کامیابی کا راز دریافت کریں گے۔ تاکہ وہ بھی اس پہ عمل پیرا ہو کر کامیابیاں حاصل کر سکیں گے۔ دیر سے ہی سہی۔ مگر صحیح گر تو مل جائے گا۔ وطن عزیز میں جینا آرٹ ہے یا

سائنس یا ریزہ کی کشتیوں میں نکل بھاگنا افضل ہے اس کا فیصلہ نہ ہو پایا۔

حمید کے فارم ہاؤس پر دعوت کا انتظام تھا۔ اس نے بااثر لوگوں کی طرح سرکاری سیکورٹی گارڈز لے رکھے تھے۔ جو وردی ڈانٹے رعب سے پھرتے۔ باورچی، خانساماں، ویٹر وغیرہ کا نام بھی سرکاری طور پہ سرکاری ریکارڈ میں درج تھا۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ سے ان سبھی کی تنخواہ بطور سیکیورٹی گارڈز جاری ہوا کرتی۔ ان کی تعداد یاجوج ماجوج کی مانند بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ ایک بار وی آئی پیز کے سیکورٹی گارڈز کی تنخواہیں ادا کرنے کی سکت ہی نہ رہی تو میونسپلٹی کے خاکروبوں کی تنخواہ انہیں ادا کردی گئی۔ سب سے کمزور طبقہ خاکروب ہی تھا۔ وہ صرف میونسپلٹی پر دھرنا دیتا اور جھاڑو چھوڑ ہڑتال ہی کر سکتے تھے۔ اور صفائی نصف ایمان ہے۔ دیواروں پہ لکھنے والے اُبلتے گٹروں سے کودتے پھاندتے مضبوط ایمان کے باعث کبھی توجہ نہ دیتے کہ دائیں بائیں ہو کیا رہا ہے۔ بلکہ دل جمعی سے سمجھوتا کیے رہتے۔ متعفن نالیوں پہ کڑاہی گوشت کھانے والوں کا شہر اس قدر گندا بدبودار تھا کہ ہڑتال سے کسی کے کان پہ جوں نہ رینگی۔ ویسے یہ سیکورٹی گارڈ بھی Crow Scare تھے۔ پرندوں کی مانند صرف عوام ہی ان سے ڈرتے عملی طور پہ تو خاکروب ہی بہتر تھے جو جھاڑو ہی پھرا دیتے۔ زندہ رہنے کا کچھ ثبوت تو دیتے۔ کچھ تنخواہ حلال کرتے۔

اس شام سبھی دوست تیاری سے آئے تھے کہ خود جاگتے رہیں گے۔ مگر حمید کو ٹلی کر دیں گے۔ ایک جانب یخنی تیار ہو رہی تھی تو دوسری جانب کھڈی کباب کے مزار پہ بھوبھل میں انگارے سلگ رہے تھے۔

یوں تو ایشیا میں عورتیں اور یورپ میں مرد ہی پیگ بناتے رہیں۔ مگر چالیسواں پہ ایرانی یا افغانی ڈانسر نہیں بلوائیں تھیں۔

رفیق کا مشورہ تھا کہ پانچوں درویش قصہ چہار درویش کی طرح اپنی اپنی کہانیاں بلا کم و کاست سنائیں۔ جو مسلم لیگی حکومت کی طرح بستر بدلنے والی عورتوں کی موجودگی میں ممکن نہ تھا۔ جانے کہاں کہاں بھانت بھانت کے درباروں میں ڈنڈوت کرتی، مجرا سجاتی پھرتی ہیں۔ ان کے سامنے راز افشاں کرنا ممکن نہیں تھا۔

شبیر نے پہلی بوتل کھولی۔ دوستوں کے لیے پیگ بنائے۔ پہلا سپ چونکہ رواجاً ہی بڑا لیا جاتا ہے۔ ٹوسٹ کیا اپنی دوستی کے نام پیمانے گردش میں آ گئے۔ چونکہ وہ چاروں درویش باہم سازش کر چکے تھے۔

اس لیے یہ طے پا چکا تھا کہ حمید کو آخر میں گفتگو کا موقعہ دیا جائے، پہلے ساقی بعد میں باقی کے اصول پر شبیر نے درد بھری کتھا سنائی جس کے اکثر حصے وہ جانتے تھے۔ بل کہ کافی حد تک چشم دید گواہ بھی رہے تھے۔ یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ قصہ پانچ درویش ختم ہونے پر ہی کھانا لگے گا۔ چاہے مرغ کی بانگ ہی بلند ہونے لگے۔

شبیر نے تمہید باندھی۔

"سنگت یہ عجیب سا شہر ہے شال کوٹ، جہاں ہر شخص شال اوڑھے مول کیے پھرتا ہے۔ جب سے چلتن کی بروری شراب بجھوا دی ہے۔ مری بروری کے ٹرک دھڑا دھڑ آ رہے ہیں۔ سمندری راہوں سے سمگل شراب آتی ہے۔ شہر میں بھی قدیم کوئٹہ ڈسٹلری سوا سو برس سے برانڈی، جن، وہسکی، کرینی بیئر بنائے جا رہی ہے۔ مگر کیا مجال کہ کوئی شہری آب زلال کو منہ لگاتا ہو، یہاں قانون میں شراب رکھنا پینا تو جرم ہے۔ شراب بنانا شراب بیچنے کی آزادی ہے۔ مارکیٹوں میں بازاروں میں سمگلنگ کا سامان عام فروخت ہوتا ہے۔ مگر شہر سے لے کر نکلو تو پکڑے جاؤ گے۔ ایسے ہی ایمانی جذبے مسلم لیگی زعما نے پاکستان کو دیے۔ پاک۔ستاں پاک لوگوں کی دھرتی۔ جبکہ عربوں نے ملاؤں سے فتویٰ لیے کہ پندرہ فی صد الکوحل والی شراب جائز ہے۔ مزے سے اب شراب کی بوتلیں مارتے ہیں۔ دوبئی میں دنیا کی اعلیٰ شراب کے بار کھلے ہیں۔

کچھی سے بھی دیسی شراب کے پیپے آتے ہیں۔ مگر کیسی سعادت ہے کہ پورے شہر میں کوئی پینے والا نہیں اسی ایمانی منڈوے پر قدرت نے خفا ہو کر برف باری روک لی۔ لعل لنڈن تک افغان ولیج بن چکا ہے۔ لہٰذا آج کی رات تو سچ بولو چند لمحوں کے لیے ہی سہی۔ میں اپنی سچی کہانی سناتے ہوئے امید کرتا ہوں کہ سبھی سچ بولیں گے۔"

اس تمہید کے بعد شبیر ٹوٹا فلموں کی طرح کہیں کہیں سچ کے ٹوٹے لگاتا چلا گیا۔

رات بھیگ رہی تھی۔ سجی کی خوشبو دھوئیں میں لپٹی ادھر ادھر ہوا کے دوش پہ اڑ جاتی۔ جس کے باعث چلتن اور مردار کے بھوکے گیدڑ بھی چھپتے چھپاتے بڑھنے لگے تھے۔

حمید نے بالکل ہی توجہ نہ دی کہ اس کا پیگ نسبتاً گہرے رنگ کا کیوں ہوتا ہے۔ وہ چونکہ میزبان تھا وہ بچھا جا رہا تھا۔ محفل میں محمود و ایاز ایک ہو چکے تھے۔ وہ دوبارہ بچے بن گئے۔ جو لنچ بکس ساتھ ہی لایا کرتے اس میں شیئر بھی کرتے اور کلاس میں داخل ہونے والی ہر عورت سے التجائیں کرتے

مجھے میری امی کے پاس لے جاؤ۔ چوتھا درویش اپنی آپ بیتی شروع کر چکا تھا کہ حمید نے کسی قدیم بادشاہ کی طرح تالی بجائی۔ بار ٹینڈر کو اشارہ کیا۔ جو حفظ مراتب کے طور پہ دور کھڑا اسپلائی لائن برقرار رکھے ہوئے تھا۔ اس نے ادب سے درمیان میں شی واز ریگل Royal Salute رکھ دی۔ جس کی قیمت اسی ہزار روپے سے تو کچھ زیادہ ہی تھی۔ بھٹو کی پسندیدہ وہسکی دراصل مہنگی نہیں ہوئی تھی بلکہ روپیہ قدر کھو کر ٹیں پیسہ کا ہو چکا تھا۔ خاردار تاروں والے پاک ملک میں ایمانی درجات بڑھ رہے تھے۔ کرنسی ڈوبتی جا رہی تھی۔ اتنی اعلیٰ وہسکی دیکھ کر رندوں کی محفل جھوم اٹھی۔ حمید کی تعریف بھی کی۔

چوتھا درویش گنگ رہ گیا۔

”جانے دو میری آپ بیتی، سبھی تو جانتے ہو۔ اس نے لپک کر پاری پیگ بنایا جو ہوتا تو ہے دو ہی انگلیوں کا۔ مگر پاری پہلی اور چوتھی انگلی کے ناپ کا پیگ بناتے ہیں۔ محفل میں جو اضطراب بپا ہوا جو بھگدڑ مچی۔ سامنے پیگ دھرنے کے باعث سارے دوبارہ آب زلال میں ڈوبے غوطے کھانے لگے۔ اب وہ ہوش اور بے ہوشی کے درمیان ڈوب ابھر رہے تھے۔

چوتھے درویش کے فرار سے حمید کی باری آئی۔ ایک لمبا سپ لے کر حمید نے داستان کا آغاز کیا۔

”دوستو! میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے، ان دنوں آتش جوان تھا۔ ایک ٹھیکہ لینے میں سردار کے ہمراہ لاہور پہنچا۔ اس کے ہاتھ لمبے تھے۔ یاری دوستی میں چلا آیا۔ یوں تو وہ دلیر تھا پہلا قتل دس برس کی عمر میں کیا تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ پستول کی گولی اتنی دور مار کرتی ہے۔ جبکہ ڈیلر زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا کہ چھ سو گز تک ڈھیر کر دے گی۔ سردار نے ڈیلر کی بحث سے اکتا کر دور کھڑے گن مین پر گولی چلائی۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین بوس ہو گیا۔ سردار خوش ہوا اور پستول خرید لیا۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ وہ جب بھی بستر میں جا تا ٹن ہو کر تو سارے مقتولین دیواروں پہ چپک جاتے۔ کسی کے سینے سے خون نکلتا تو کسی کی حلق سے خوں بہتا۔ جس کے باعث وہ ایک وفادار کمرے میں ساتھ سلایا کرتا۔ اس سے گفتگو کرتے ہوئے وہ سو جاتا۔ ہوٹل میں بھی مجھے ہی ساتھ رکھا۔ یہ میرے لیے نیا تجربہ تو نہ تھا۔ مگر جب شبستان کی پری آئی تو اس نے کہا کہ زحمت نہ ہو تو باہر چلے جاؤ لاؤنج میں جا بیٹھو۔ پری کو لانے والا بوڑھا ایک یحیم شحیم شخص تھا۔ جو بے تکلفی سے بولا کہ باؤ جی لاؤنج میں چلیے۔ باتوں باتوں میں ہی

رات گزر جائے گی۔ میں نے سردار سے کہا کہ میری نیند کیوں خراب کرتے ہو۔ ایک کونے میں دبکا رہوں گا۔ یوں بھی گروپ سیکس قدیم یونان روم سے چلی آ رہی ہے۔ سردار ترت بولا کہ تم مجھے دیکھو گے اور لوگوں کو بتاؤ گے کہ کولہے پر فلاں رنگ کے اتنے تل ہیں مجھے بھی سخت تاؤ چڑھا۔ میں نے کہا کہ مرد ڈیڑھ لاکھ برس سے اسی پرزہ پاٹ کے ساتھ پیدا ہو رہا ہے۔ اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ پتہ نہیں کس دور سے انسان نے ستر پوشی شروع کر دی۔ عورت کا چلو سمجھ آتا ہے کہ بدصورت ترین جمالیات کے برعکس ہیں مگر مرد کا سمجھ نہیں آتا۔ اور میں حسن کرتا بھی دوں تو کیا ہوگا۔ سردار نے گھونسہ دکھایا، نکلو، تمہیں پتہ نہیں کہ لوگ کیا سمجھیں گے۔ کمبخت یورپ نے تو مردوں کی دوستی بھی مشکوک بنا دی ہے۔ مجبوراً ہی میں اسی پہلوان جی کے ساتھ لاؤنج میں ڈھیر ہو گیا۔ ایک بھاڑی کے ساتھ رات بھر جاگنا تھا۔ لیکن اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ نہ ہی میں پلے سے کمرے کا کرایہ دینے کے قابل تھا۔ سردار کا تو روٹی کپڑا مکان سرکار کے ذمے تھا۔

پہلوان جی کے لیے بھی کافی منگوائی تا کہ جاگتا رہوں۔ سوچا کہ اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈر۔

بلوچستانی ذرا بڑی عمر والے کو خواجہ، کاکا، یا حاجی کہہ کر پکارتے ہیں۔ میں نے کاکا کو اردو میں بدل کر چاچا کہا اور سوال کیا کہ چاچا تم کیا کھاؤ گے۔ چاچا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے انکشاف کیا پہلی بار اس نے اپنے لیے یہ قابل احترام لفظ سنا ہے۔ حالانکہ میں نے تو عادتاً ہی کہا تھا۔ مجھے تو یوں بھی Hypoglycemia ہے۔ بار بار کچھ کھانا پڑتا ہے۔ پہلوان جی بھی پانی کی بوتل میں جن ملا کے پیئے جا رہا تھا۔ ہماری بات چیت چل نکلی۔ بڑے ہی مزے کی باتیں کرتا رہا۔ رات گپ شپ میں بیت گئی۔ صبح دم جب وہ اپنی ایکسپورٹ سمیت کر جانے کے لیے اٹھا تو صدق دل سے بولا کہ باؤ جی آج کی رات اچھی گزری تم نے اتنی عزت دی کہ کبھی نہیں ملی تھی۔ میں تمہیں ہمیشہ ہی یاد رکھوں گا۔ میں نے پوچھا کب سے یہ سب کر رہے ہو۔ اس نے کہا کہ یاد نہیں۔ یہ اس کا جدی پشتی کاروبار ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی درآمد برآمد کے دھندے میں لگ گیا۔ میں نے کہا کہ تم بھی مجھے زندگی کے تجربے کا نچوڑ دو۔ تا کہ میں بھی تمہیں اپنے محسن کے طور پر یاد رکھوں گا۔ اس نے اجالا ہوتے ہی خالی بوتل پھینک دی تھی۔ چائے کا آرڈر دیا۔ ہم چائے پینے لگے۔ اس نے تجربے کا نچوڑ دیا کہ جب کوئی

رقاصہ یا اس بازار کی کہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ رقم نہیں لے گی تو سمجھ جاؤ کہ موت کا سامان ہو رہا ہے۔ موت کا منظر، مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ تابوت تیار کیے بیٹھی ہے۔ رقم دیتے رہو ورنہ وہ سموچا نگل جائے گی۔ ایسی عورتوں کو کبھی بھی کمزور مت سمجھنا ورنہ مارے جاؤ گے۔ ان سے پنگہ مت لینا۔ تیسری اور آخری نصیحت کہ طاقتور کی درخواست کو حکم سمجھ کر مان لینا۔ بل کہ حکم کی تعمیل کرنا۔ اس دنیا میں طاقت ہی چلتی ہے۔ جو طاقت کو نہ مانے وہ تو خدا کو نہیں مانتا۔ میں نے سوچا کہ پہلوان سچ ہی کہتا ہے۔ سلومی نے Striptease دکھا کر بادشاہ سے انعام میں یوحنا اصطباغی کا سر طشت میں منگوا لیا تھا۔ حالانکہ سلومی کے پاس دکھانے کو تین چیزیں تھیں۔ جو وہ ڈیڑھ لاکھ برس سے دکھائے جا رہی ہے۔ سلومی سے تو جرمن کار ہی بہتر ہے جو ہر برس نیا پرزہ پارٹ لگا کر آتی ہے۔ حسن کا جادو جگاتی ہے۔ کاروں کے بائیکوں کے ماڈل بدلتے آئے ہیں۔ عورت اسی باڈی Chassis پہ چلی آتی رہی وہی فیول پمپ ہوز پائپ ایک نٹ بلٹ تک نہ بدلا۔ میں نے اس بھاڑی کے تجربے کا عرق کشید کر لیا۔ اسے ہی پیر مان لیا۔ کمبخت نے دریا کوزے میں بند کر دیا۔ وہ تو کولمبے منگاتی پارٹس ہلاتی قتالہ کے ساتھ نکل گیا۔ مجھے ایک زندہ آئیڈیالوجی دے گیا۔

حمید کو محسوس ہوا کہ اس کے دوستوں نے پچک رکھ دیے ہیں۔ وہ بھی اسے حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ اس عالم محویت میں مبہوت رہ کر رفیق نے پہلا سوال کیا۔

’’تم نے اس بھاڑی کی بات مانی۔ ساری اخلاقیات چھوڑ کر تم ہر قبضہ گیر، ہر آمر، ہر طاقتور ہر صاحب اقتدار کی جھولی میں جا گرتے رہے۔

رفیق کی آنکھوں میں خون سا اتر آیا تھا۔ جیسے چلتن کی تینوں چوٹیوں پر وقت مغرب بلوچستان کے شہدا کا خون اتر آتا ہے۔ جیسے خون گواڑخ بن کے دھرتی کا سینہ چیرتا باہر نکل آتا ہے۔ جیسے خیسن خنی بن کر آنکھوں سے چھلک اٹھتا ہے۔ پل بھر میں دوست اس کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔

حمید گھبرا سا گیا۔ رفیق نے تو اپنی حسین من موہنی درجنوں دلوں کی دھڑکن ہیروئن بیوی کو بدکرداری پہ سریا مار مار کے ٹوکنز بابا قبرستان پہنچا دیا تھا۔ کیا عجب بوتل ہی سر پہ دے مارے۔ اس کے سرکاری گارڈز لاتعلق سے دور کھڑے تھے۔ سرکاری کلاشنکوفیں ان کے کندھوں پہ لاوارث بچوں کی طرح جھول رہی تھیں۔ جنھیں ریڈزون کے ابا ناجائز اولاد کی طرح گریبوں کے

منڈوں میں بانٹ کر کہتے ہیں کہ حق کی آواز اٹھانے والوں کو مارو تم مرے تو شہید وہ مرے تو واصل جہنم نہ حور نہ سیپی سے نکلے ان چھوے موتیوں سے غلمان۔

معاً اسے یوں لگا وہ دشمنوں میں گھر گیا ہے۔ بچپن کے دوست اسے اجنبی لگ رہے تھے۔ ان کی خشمگیں، کینہ توز نظریں اسے چھلنی کیے دیتی تھیں۔

بھرے پیگ فرشی نشستوں پہ بے ترتیب پڑے تھے۔ کچھ کہے بغیر ہی وہ سبھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ خاموشی سے چوٹ پہنے اس قدر پینے کے باوجود بھی ان کے انداز میں لکنت، لڑکھڑاہٹ نہیں آئی تھی یوں تو حمید سے کسی نے کچھ نہ کہا۔ مگر بھی ایک منظم گروہ کی طرح کام کر رہے تھے۔

حمید نے آواز دی ''خان بہادر رائے بہادر، شمس العلماء تاج برطانیہ کے وفادار اب تک ہم پہ حکومت کر رہے ہیں۔ ہمارے سارے لیڈر چاہتے تھے کہ ملکہ برطانیہ ہم پر حکومت کرے۔ اس کو وفا کا یقین دلاتے۔ غالب نے کوئین وکٹوریہ کا قصیدہ لکھا سید احمد سے اقبال تک تاج برطانیہ کے سرمچار یعنی Knight رہے۔ میں نے کون سا کوئی نیا دھرم اختیار کیا جو تم خفا ہو بیٹھے ہو''

مگر اس کے احتجاج پہ کوئی نہ رکا۔ حمید نے دیکھا کہ سیاہ شیشوں سے چھپے جھنڈوں والی قابلی گاڑیوں کے ساتھ، جیب میں پڑے وفاداری کے کارڈ کے ساتھ وہ اکیلا ہی رہ گیا۔ محفل میں Royal Salute کے علاوہ کوئی بھی اس کا اپنا نہ رہا تھا۔ آس پاس بھی تاریکی زیادہ ہی گہری ہوئی جاتی تھی۔

بچپن کے دوست سائے میں ڈھلے، ہیولے ہوئے پھر اندھیرے میں مدغم ہوئے۔ تاریکی دور کرنے کے لیے اس نے وِسکی حلق میں انڈیل لی۔

''ان کی دوستی شاہدرہ کی گلیوں میں سائیکل دوڑانے، بسی کے ہندوں محلہ کی ناہموار راہوں پہ چلنے، چوبرجی روڈ کے چینکی ہوٹل میں چائے پینے سی nostalgic تھی۔ کتنے ہی سماجی معاشی فاصلے آچکے تھے''

معاً اندھیروں سے اس کے دوست پلٹ پڑے۔ ان کے چہروں پہ وہ کھینچاؤ وہ جلال نہ تھا۔ وہ بے تکلفی سے آ بیٹھے۔ رفیق نے ان کی نمائندگی کی۔

''ہم نے سوچا عقیدوں کے سرکاری ذبح خانوں میں تمہیں ڈوبنے کو اکیلا نہیں چھوڑیں گے مایوسی گناہ ہے۔ اس چالیسویں میں سابقہ زندگی دفن کر دو - دوبارہ ہمارے دوست بن جاؤ''

☆☆☆☆☆

ادھوری محبت

محمد سعد

سوات کی فضاؤں میں ایک خاص ٹھنڈک اور رعنائی تھی، جہاں کے لوگ پہاڑوں جیسے مضبوط اور چشموں جیسے شفاف دل کے مالک ہوتے ہیں۔ انھیں میں ایک گھر تھا جہاں انعام رہتا تھا۔ انعام اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا، اور اس کی دو بہنیں تھیں۔ بڑی بہن کی شادی ہو چکی تھی، اور چھوٹی بہن ابھی مدرسے میں زیر تعلیم تھی۔ گھر کی مالی حالت کچھ خاص نہ تھی۔ والد لکڑی کا کاروبار کرتے تھے، جس سے بمشکل گزارا ہوتا تھا۔ انعام نے دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک کاسمیٹک کی دکان پر ملازمت کر لی تھی تاکہ والدین کا ہاتھ بٹا سکے۔ وہ صحت مند، توانا اور خاصا خوب صورت نوجوان تھا، اس کی شخصیت میں سوات کے پہاڑوں جیسی سادگی اور دلکشی تھی۔

ایک دن، دکان پر معمول کے گاہکوں کا رش تھا۔ انعام اپنے مالک کے ساتھ گاہکوں کو چیزیں دکھا رہا تھا کہ اسی اثنا میں کچھ لڑکیاں دکان میں داخل ہوئیں۔ یہ سب سوات کے ہی رہنے والے تھے، ماسوائے ایک لڑکی

کے جوان کے ساتھ تھی۔ انعام کی نظر اس لڑکی پر پڑی اور وقت تھم سا گیا۔ وہ درمیانے قد کی، نہایت حسین اور دلکش تھی۔ اس نے نظر کا چشمہ لگایا ہوا تھا جو اس کی خوب صورتی کو مزید چار چاند لگا رہا تھا۔ یہ لڑکی، رفعت، لاہور سے اپنی خالہ کے گھر گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے آئی تھی۔

وہ سب پرفیوم خریدنے آئی تھیں۔ انعام نے ان کو پرفیوم دکھانے شروع کیے۔ ایک موقع پر، رفعت کے ایک کزن نے پرفیوم کی ایک بوتل اٹھائی اور کہا، ''رفعت، یہ والا پرفیوم چیک کرو، یہ کتنا اچھا ہے!'' اس لمحے انعام کو پہلی بار اس خوب صورت لڑکی کا نام معلوم ہوا: رفعت۔ یہ نام انعام کے دل میں اُتر گیا۔ رفعت کی ہنسی اور اس کی بول چال انعام کے ذہن میں نقش ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ برسوں سے اسی چہرے کی تلاش میں تھا۔

رفعت اور اس کی سہیلیاں چیزیں خرید کر چلی گئیں، مگر رفعت کا چہرہ اور اس کی مسکراہٹ انعام کے ذہن میں نقش ہو گئی۔

اگلے چند دن انعام نے بے چینی میں گزارے۔ اس کی نگاہیں ہر آنے والے گاہک میں رفعت کو تلاش کرتیں۔ کئی دن بعد، ایک شام رفعت دوبارہ اپنی خالہ کے ساتھ دکان پر آئی۔ انعام کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے ہمت کی اور رفعت سے بات کرنے کی کوشش کی۔ باتوں ہی باتوں میں اسے رفعت کا نمبر مل گیا۔ یہ نمبر انعام کے لیے کسی خزانے سے کم نہ تھا۔

دونوں کے درمیان باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انعام دن رات رفعت کے بارے میں سوچتا رہتا۔ ان کی ملاقاتیں دکان پر ہونے لگیں، کبھی کبھار انعام بہانہ بنا کر کام سے چھٹی لیتا اور رفعت سے ملنے چلا جاتا۔ رفعت کی باتوں میں ایک کشش تھی، اور انعام کو لگتا تھا کہ اس کی زندگی میں رنگ بھر گئے ہیں۔ اس نے رفعت کو اپنے حالات بتائے، اپنے خواب سنائے۔ رفعت بھی اس سے کھل کر باتیں کرتی تھی، لیکن اس کے لہجے میں کبھی کبھی ایک ہلکی سی جھجک نمایاں ہوتی۔ انعام اس جھجک کو سمجھ نہ پایا۔ اسے لگتا تھا کہ رفعت بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتی ہے جتنا وہ کرتا ہے۔

محبت کا یہ سلسلہ کئی مہینے چلا۔ انعام نے رفعت کو اپنی زندگی کا حصہ مان لیا تھا، اس نے اپنے والدین سے بھی رفعت کا ذکر کیا، حالانکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ شاید ان کے

لیے یہ سب آسانی سے قبول کرنا مشکل ہو گا۔ ایک دن، انعام نے رفعت کو کال کی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ رفعت سے شادی کی بات کرے گا۔ رفعت نے فون اٹھایا، لیکن اس کا لہجہ سرد اور غیر مانوس تھا۔

''انعام، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' رفعت نے کہا۔

انعام کا دل ڈوبنے لگا۔ ''کیا... کیا کہہ رہی ہو رفعت؟''

''دیکھو انعام، تم بہت اچھے ہو، واقعی بہت اچھے۔ لیکن ہم ایک نہیں ہو سکتے۔'' رفعت نے ایک ہی سانس میں کہا۔

انعام سن ہو گیا۔ ''کیا... کیا کہہ رہی ہو رفعت؟''

''میری فیملی کبھی نہیں مانے گی۔ ہم دونوں کا کوئی میل نہیں۔ تم مجھے بھول جاؤ۔'' رفعت کی آواز میں درد تھا، مگر عزم بھی۔

''لیکن رفعت، ہم نے اتنے خواب دیکھے تھے!'' انعام کی آواز بھر آئی۔

''یہ سب ناممکن ہے انعام۔ خدا حافظ۔'' رفعت نے کہا اور فون کاٹ دیا۔

انعام نے بار بار کوشش کی، لیکن رفعت کا نمبر بلاک ہو چکا تھا۔ اس کی دنیا اجڑ گئی۔ وہ راتوں کو سو نہیں پاتا تھا۔ دن بھر دکان پر اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ اس کا ہنستا مسکراتا چہرہ مرجھا گیا۔ اس نے رفعت کو ہر جگہ تلاش کیا، لیکن وہ کہیں نہ ملی۔ ہر گزرتا دن انعام کے لیے اذیت بنتا جا رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کی زندگی کا مقصد ختم ہو گیا ہے۔ سوات کے خوبصورت پہاڑ اسے قید خانے کی دیواریں لگنے لگے۔ وہ کھویا کھویا رہتا تھا، کھانا پینا چھوڑ دیا۔ اس کے والدین پریشان ہو گئے، لیکن انعام کسی کو کچھ نہ بتا سکا۔

ایک رات، جب پورا گھر سو رہا تھا، انعام اٹھا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا، رفعت کے بغیر یہ زندگی بے معنی ہے۔ وہ چپ چاپ کمرے سے نکلا اور چھت پر چلا گیا۔ سوات کی ٹھنڈی ہوا اس کے چہرے سے ٹکرا رہی تھی، لیکن اسے کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے جو خشک ہو چکے تھے۔ اس نے ایک آخری بار تاروں بھرے آسمان کو دیکھا، اور پھر ایک گہری سانس لے کر اندھیرے میں چھلانگ لگا دی۔ صبح جب والدین نے اس کا بے جان جسم دیکھا تو ان کی چیخوں سے سوات کے پہاڑ گونج اٹھے۔ انعام نے اپنے سارے خوابوں اور محبت کے ساتھ خود کو ختم کر لیا تھا۔

☆☆☆☆☆

فیض احمد فیض کے لیے

اک درد بھی رکھا نہ ہتھیلی پہ کسی نے
کیا ہم کو دیا صنعتِ دریوزہ گری نے

کیا جانیے کیوں پاؤں کی زنجیر بدل دی
پہچان لیا تھا ہمیں ایک ایک کڑی نے

اس شہر کے دن، رات سے کچھ بڑھ کے سیہ ہیں
بجھ بجھ کے بتایا تھا چراغِ سحری نے

اک وصل کا درہم کفِ خالی پہ نہ رکھا
ہم کو تو فقط رنج دیے ایک سخی نے

کس رنگ کی یہ کم سخنی، کم طلبی تھی
رسوا سرِ دربار کیا خوش نسبی نے

کب طبلۂ عطار کے مانند کھلیں گے
پابندِ قبا ہیں ابھی ظالم کے قرینے

اب سوچ رہے ہیں کہ وہ کیا سوچ رہے ہوں
رکھا نہ کہیں کا ہوسِ داد رسی نے

ہنس ہنس کے نکل آئے تھے آنسو سرِ محفل
کیا کیا نہ رلایا ہمیں یاروں کی خوشی نے

کیا جانیے کس سمت گرے خاک ہماری
کس گھاٹ اُتر جائیں بگولوں کے سفینے

ہر شام اُتر آئیں پسِ پردۂ مینا
شب تاب سن و سال و مہ تاب مہینے

خالد احمد

یہ زمانہ اُحد کے بعد کا ہے

شہر پر
سانحہ گزرنے سے
جو دراڑیں
دلوں کے بیچ پڑیں
اُن کے بھرنے میں کیا خبر
کتنا
درد جگنا تھا،
وقت لگنا تھا
لیکن
احساں غنیمِ ازل کا
اُس کے
جنگی جنون سے کیسے
چُھٹ گیا
پل میں نفرتوں کا غبار
ہوئے سب مل کے آہنی دیوار
سُن!
کسی گوشۂ غیابت سے
آ رہی ہے
اک آشنا آواز

کوئی سرگوشیوں میں
کہتا ہے
پڑھ!
جو قرطاسِ وقت پر ہم نے
بھید بین السطور لکھا ہے
شب کہاں تھی
سقوطِ ڈھاکہ کی
وہ شکستِ انا کا موسم تھا
دیکھ!
درماں سیاہ یاد کا ہے
یہ زمانہ
اُحد کے بعد کا ہے

جلیل عالی

چارہ گری

یہ ادویات کہ جو آس پاس رکھی ہیں
توقعات ہیں امید زندگی کی طرح
توہمات ہیں شمعوں کی روشنی کی طرح
یہ ایک سانس کا اک سانس تک جو وقفہ ہے
سفر میں لحظۂ تاخیر کے سوا کیا ہے
یہ چارہ گر جو مرے آس پاس بیٹھے ہیں
بلاجواز خجل ہیں اداس بیٹھے ہیں
یہ ادویات یہ چارہ گری بہانہ ہے
یہ صرف خواب ہے یہ زندگی فسانہ ہے

صفدر صدیق رضی

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

ہر گلی ، ماہ رخی ، مہر سنی کے چرچے
کوئی سنتا ہی نہیں در بدروں کا رونا

ناممکنات کی ہتھیلی پر لکھی خواہش

دل ایک دائرے میں گھومتا ہوا
تمہاری یاد کے کئی برس پرانے مرکزے کی کھینچ سے
نہیں نکل سکا

سحر کے وقت جالیوں سے چھن کے آتی روشنی
تمہارے پھول جیسے چہرے پر پڑی
گلال سا بکھر گیا
تو لمس کی امید میں تمام دن گزر گیا

یہ ممکنات میں نہ تھا
سجیلی آرزو کی تتلیاں پکڑنے کا
کوئی جواز چاہیے تھا
اور جواز کچھ نہ تھا

پھر ایک رات یوں ہوا
شدید بارشوں کی سیلی سیلی چھت پہ میں
فلک سے گرتی اوس میں پڑا رہا
مرے سلگتے ماتھے پر
تمہارے ہاتھ کی صباحتیں چمک گئیں

یہیں پڑی ہیں آج تک
گلاب لمس کی مہک لیے ہوئے

کہاں ہو تم
وہاں نہیں، جہاں ہوں میں

دھڑک رہا ہے آج تک
انہی حسین ممکنات کے تصورات کی ہوا میں
جھومتا ہوا
دل ایک دائرے میں گھومتا ہوا

طالب انصاری

پریم نگر

جب مری آنکھ کے جزیرے میں
کوئی گلشن مہکنے لگتا ہے
کوئی طائر چہکنے لگتا ہے
کوئی بلبل صدا کے شانوں پر
کوئی دلکش سا گیت گاتی ہے
کوئی کوئل صبا کے شانوں پر
بیٹھ کے تیری میری چاہت کے
سینکڑوں گیت گنگناتی ہے
شادیانے سے بجنے لگتے ہیں
زندگی رقص کرنے لگتی ہے
پھر مرا دل، مرا انوکھا دل
جانے کیونکر مچلنے لگتا ہے
ہر گھڑی مسکرانے لگتی ہے
اور لمحوں کے پھول ہونٹوں پر
صرف تیرا ہی نام آتا ہے
پھر میں کتنے ہی گیت بنتا ہوں
میں جو تنہا تھا، بزم کی صورت
زندگی کے نگار خانے میں
اپنی حالت پہ رشک کرتا ہوں
اور پھر نت نویلے لفظوں میں
جانے کتنے ہی رنگ بھرتا ہوں
لفظ پھر گیت بننے لگتے ہیں
حرف غزلوں میں ڈھلنے لگتے ہیں
میں کہ جو میں تھا
میں نہیں رہتا
تم کے ساگر میں ڈوب جاتا ہوں
گاہے ہنستا ہوں، گاہے گاتا ہوں
اور ہر درد بھول جاتا ہوں

شیخ اقبال

پاک وطن کے جانباز شاہینوں کے نام

عزم و ہمت کے اعلیٰ معیار کو چھونا ہے
روشنیوں نے سورج کی دستار کو چھونا ہے
اڑتے اڑتے دور افق کے پار کو چھونا ہے
خالد طارق قاسم کے کردار کو چھونا ہے
اپنے زورِ بازو کو شمشیر بنانا ہے
ان ہاتھوں سے ملت کی تقدیر بنانا ہے
قائد اور اقبال سے ہم وہ عہد نبھائیں گے
اس دھرتی کے ذروں کو مہتاب بنائیں گے
پاک وطن ہم تیرے سو سو ناز اٹھائیں گے
تیرے ہر دشمن کو موت کا مزہ چکھائیں گے
اپنا تن من دھن تجھ پر قربان کریں گے ہم
اپنے خون سے روشن پاکستان کریں گے ہم
علم سے اپنے سینوں کو معمور کریں گے ہم
ظلم کو تیرے سائے سے بھی دور کریں گے ہم
تیرے اک اک کونے کو پرنور کریں گے ہم
دشمن کے ہر خواب کو چکنا چور کریں گے ہم
پرچم سبز ہلالی جان سے پیارا رکھیں گے
اس تارے کو اپنی آنکھ کا تارا رکھیں گے
پیار محبت اس دھرتی پہ عام کریں گے ہم
سب سے اونچا پاکستان کا نام کریں گے ہم
روشن و رخشاں وطن کی ہر اک شام کریں گے ہم
دیس کی خاطر اس مٹی میں مل جائیں گے ہم
شاخوں پر پھولوں کی صورت کھل جائیں گے ہم

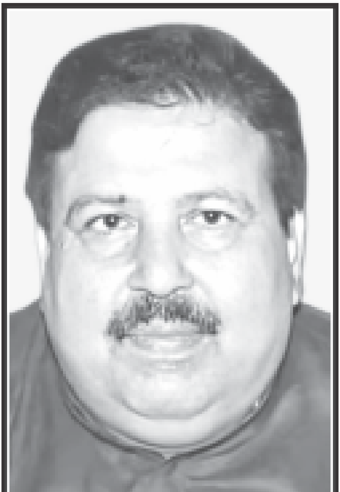

مسعود احمد

سرنڈر

تم چاہو تو ہو سکتی ہے
کہیں بھی ایسی بات
آدھے دن پر چھا سکتی ہے
کالی گہری رات

کوئی کہیں سے آ سکتا ہے
وقت کا چھوڑ کے ہاتھ
کبھی کہیں بھی بن سکتی ہے
ناممکن ہر بات

تیری جانب دیکھ رہی ہے
میری آدھی ذات
تجھ سے آگے سوچ سکوں میں
کیا میری اوقات

انت بے انت بھی سب تیرا ہے
سب تیری تخلیق
وقت سے پہلے بعد اور آگے
سب تیری توفیق

میرے لئے تو ویسا کر دے
تجھے لگے جو ٹھیک
آزادی کا متلاشی ہے
وقتوں کا زندیق

سلیم نگار

خامی

کاتبِ تقدیر تجھ سے ایک شکوہ ہے مجھے
کس قلم سے تُو نے لکھا ہے بتا میرا نصیب
دائروں میں ہی بھٹکتی جا رہی ہے زندگی
اس مسافت کی اذیت سے ہوں میں اکتا گیا
آبلوں سے خون رستا ہے تو گر پڑتا ہوں میں
پھر اٹھاتی ہے کوئی امید انگلی تھام کر
تشنگی کا بوجھ بھی ہونٹوں پہ رکھا ہے مرے
کوئی چشمہ، کوئی ندیا ہی دکھائی اب تو دے
پیاس کے اس کرب سے مجھ کو رہائی اب تو دے
اور مردہ خواب بھی آنکھوں میں رہتے ہیں کئی
میں انہیں دفنا نہیں پاتا اسی امید پر
عین ممکن ہے کہیں ایسا مسیحا تو ملے
ایک لفظِ کن سے مردوں کو حیاتِ نو ملے
ہاں سفر کٹتا نہیں ہے میرا یہ دن رات کا
مجھ پہ کھلتا ہی نہیں عقدہ کبھی اس بات کا
جس جگہ سے بھی چلوں واپس وہیں آتا ہوں میں
اس لیے تو گردشِ دوراں سے گھبراتا ہوں میں
کیا مقدر ہے مرا جب سوچتا ہوں میں کبھی
اپنے ہاتھوں کی لکیروں سے الجھ جاتا ہوں میں
بارہا میں نے ہتھیلی کو کریدا بھی بہت
اور اک دیوانگی میں ہاتھ چھیدا بھی بہت
کوئی بدلاؤ نہیں آتا مرے دن رات میں
جانے ایسی کونسی خامی ہے میری ذات میں

ارشد محمود ارشد

علم

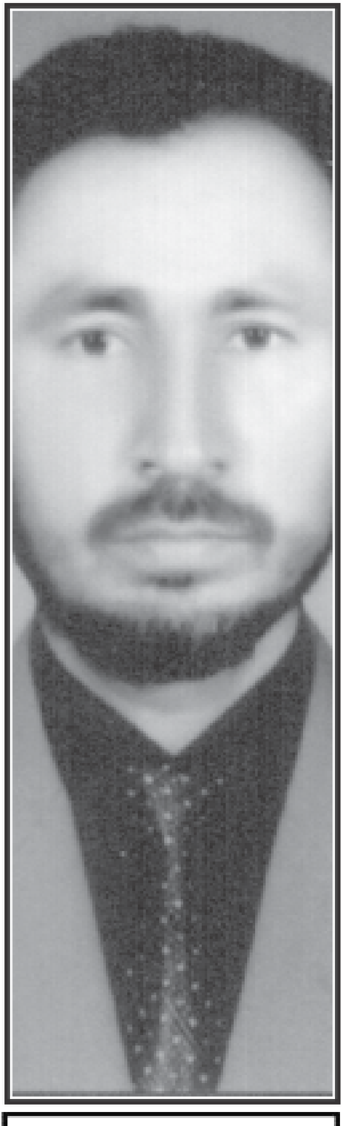

سرسبز ہو رہے ہیں اشجار علم سے
سب پھول پا رہے ہیں مہکار علم سے

بنتا ہے سب کا پختہ کردار علم سے
تم بھی سجا لو اپنی گفتار علم سے

کاغذ سے مل رہی ہے دنیا کی ہر خبر
دنیا میں چھپ رہے ہیں اخبار علم سے

ہر شخص کی ترقی کا راز ہے یہی
زر کے لگا رہا ہے انبار علم سے

تم کو بھی زندگی میں لانی ہو گر بہار
تم بھی سجانا دل کا دربار علم سے

معلوم ہو رہا ہے نظمِ جہاں کو دیکھ
چلتی ہے ہر وطن کی سرکار علم سے

پانی میں چل رہے ہیں دنیا کے جو جہاز
ظاہر ہوئے ہیں یہ بھی آثار علم سے

دنیا کے دشت و صحرا، جنگل بھی اے ندیم
بنتے چلے گئے ہیں گلزار علم سے

ریاض ندیم نیازی

ناجائز قبضے کا نوٹس

توڑنے
ٹوٹنے سے
ہم مزید بکھریں گے
دُنیا
ہمیں یکجا ہونے
دوبارہ پھر سے جوڑنے
امن کی ترغیب دے گی
کچھ صلح پسند
آوازوں کے لشکر
مختلف خِطّوں اور تہذیبوں سے
ہمارے لیے صبر، تواضع کے پھول لائیں گے
لیکن
نفرت کا کُھردرا جغرافیہ
حسد کا اپنا بلیک ہول ہے
جہالت کی شاہراہ پر
برتری کا سنگِ میل
توازن کے اہرام سے محروم ہے
جنگی جنون نے
ہمیشہ آگ اور خون سے
تباہی کا منظر نامہ تخلیق کیا
صدیوں سے
آدمی حرص و ہوس کے محاذ پر
خواہشات کے ہتھیار لیے گھوم رہا ہے
نجانے
یہ آگ
مزید کتنے انسانوں کا وجود
بھسم کرے گی
خدا
اپنی زمین سے بے نیاز نہیں ہے
وہ خاموشی سے
کُن فیکون کرے گا
عالمی طاقتیں
ظلم کو لگام
ناجائز قبضے کا نوٹس کب لیں گی؟

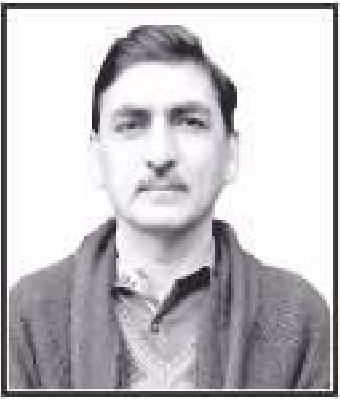

امجد بابر

تانگے کی آخری سواری

صبح سویرے اک تانگہ
اپنے اسٹینڈ پہ آتا ہے
جان پہچان کا
گھوڑا ابھی ہے دیکھا بھالا
چند منٹوں میں
اِدھر اُدھر سے آنے والے
بھر دیتے ہیں تانگہ
سب کی اپنی اپنی منزل
سب کے اپنے اپنے کام
کیا معلوم کہاں پڑ جائے انجان کو شام

میں بھی اُس تانگے کا سوار ہوں
میری منزل کوئی نہیں
سواریاں اُترتی چڑھتی ہیں حسبِ معمول
لیکن میں چپ چاپ وہاں بیٹھا رہتا ہوں
لوگوں کے چہروں کو تکتا رہتا ہوں
ڈھونڈتا رہتا ہوں انجانی شکلوں میں
شاید کوئی جانا پہچانا چہرا مل جائے
اُس تانگے کی آخری ایک سواری ہوں مَیں
جس کا کوئی ٹھکانا ہے اور نہ منزل ہے
صبح سے لے کر شام تلک اب کام یہی ہے
ڈھونڈنے والوں کا شاید انجام یہی ہے

ظہور چوہان

''حوری''

ہونٹ گلابی نین شرابی
بات کرے تو خوشبو پھیلے
حوری کو کل بولتے دیکھا
ہنستے دیکھا،
بالکل جیسے وہ ہنستی تھی
بات کا بھی انداز وہی تھا
جیسے وہ بولا کرتی تھی
مجھ پینڈو پر جیسے وہ فقرے کستی تھی
یوں لگتا تھا
اگلے لمحے
مجھ کو ہم آغوش کرے گی
ویسے ہی مدہوش کرے گی
آکسی ٹوسن اور سروٹونین سے میرے
ہونٹوں کو سیراب کرے گی
اپنے ہاتھوں کی پوروں سے مجھ کو محوِ خواب
کرے گی
(بالکل جیسے وہ کرتی تھی)

سوچ رہا ہوں
اس سے پوچھوں
جس نے حوری کی آنکھوں میں رنگ بھرے ہیں
ہونٹوں میں خوشبو رکھی ہے
دل بھی اس کے جیسا ہے نا......؟

صغیر احمد صغیر

نثری نظم

جب سے چہرا پڑھنا آیا ہے
دل میں درد کی آگ بڑھ گئی ہے
من بوجھل بوجھل رہتا ہے
جن لوگوں کی چاہت پر مان تھا
اجنبی لگنے لگے ہیں
لہجوں کی خوشبو سے
من کے بھیتر جھانکا جاسکتا ہے
لہجے تصنع کی قلعی سے چھپ نہیں پاتے
آنکھوں میں لکھی تحریر پڑھنا آتا ہو تو
چہروں کی قلعی اترنے لگتی ہے
اس سے پہلے کے ٹوٹ کر بکھریں
تنہائی اپنی آغوش وا کیے کھڑی ہوتی ہے
کسی کا دوست بن جانے سے کہیں بہتر ہے
اپنے ساتھ وقت گزاریں
خود سے محبت مشکل سہی ناممکن نہیں
زندہ رہنے کی خواہش کو جھٹلایا نہیں جاسکتا
بس کبھی کبھی موت اچھی لگتی ہے

نائلہ راٹھور

بیاء جی کا گیان

سنو بیاء جی
خدا اور چپ کے بیچ
تمھاری پلکوں پر رکے آنسو
کائنات کا انمول سرمایہ ہیں

وہ تمھیں کیسے سمجھیں
جو عشق کی "عین" سے بھی
کوسوں دور ہیں
تم سات رنگوں میں لپٹا
وہ بھید ہو
جس کی گرہیں کھولتے ہوئے
انگلیوں کی پوریں بھی رنگین ہو جاتی ہیں

تم اپنے اندر جلتی لو کے گرد
اپنی ہتھیلیوں کا حصار رکھنا
کہ اس اندھیر نگری میں
کوئی ایک بھی نہیں
جو اس لو کا سامنا کر سکے
اور اس کا انتظار کرو
جو تمھاری پیشانی کا بوسہ لے کر
جلنا نہیں، بجھنا چاہتا ہے

آفتاب جاوید

نیند

شب کے پچھلے پہر، نیند کی کھوج میں
ایک آوارہ کچھ ایسے گویا ہوا
اندھی آنکھیں حماقت نہ کر دیں کوئی
بہرے کانوں کی سازش بھی ناکام ہو
قلبِ مضطر مری بات پر دھیان دے
جسم کی قید سے جلدی آزاد ہو
روح کے تار بجنے کا یہ وقت ہے
زندگی اپنے سارے معانی لیے
شہرِ اوہام کے بے نشاں بام پر
رقص کرتی دکھائی اگر دے تمہیں
شور و شر کی کوئی فکر کرنا نہیں
عقدۂ ناکشا تک پہنچ جانا تم
زندگی کی حقیقت سمجھ جانا تم
لذتِ گفتگو میں بھی کھو جانا تم
پھر اگر سونا چاہو تو سو جانا تم

اسد رضا سحر

''انتظار کی چادر''

انتظار
ایک ایسی چادر ہے
جسے میں نے ہر موسم اوڑھا
گرم دوپہر کی تپتی ہوا میں
جاڑے کی راتوں کی نمی میں
برسات کی اس شام میں بھی
جب خاموشی بھیگتی رہی تھی
یہ چادر میں نے بُنی ہے
تمہاری چھوڑی ہوئی باتوں سے
ان وعدوں سے جو کبھی وفا نہیں ہوئے
اور ان لمحوں سے
جو میری آنکھ میں مقید ہیں
میں نے تمہیں کبھی کال نہیں کی
کوئی میسج نہیں کیا
بس دل کے کمرے میں
سوچوں کی سیاہی سے
ہر روز ایک نیا صفحہ بھرا
تم آئے نہیں
مگر وہ صفحے
آج بھی میرے تکیے کے نیچے رکھے ہیں
جیسے نیند کے محافظ ہوں
تمہاری راہ تکنا
جیسے کہ اب عادت ہے
ایک ایسی عادت
جسے چھوڑنا
خود کو مارنے کے جیسا ہے
یہ چادر----
اب پرانی ہو چکی ہے
کئی جگہوں سے پھٹ چکی
شب کی تنہائی میں
آنسو اس کے دھاگے بہالے گئے
لیکن میں اپنی من چاہی چادر
انتظار کی چادر
اوڑھتی رہی
ہر اس شب
جب دل تمھیں بھولنے سے انکاری تھا
سچ ہے---
انتظار کا کوئی موسم نہیں ہوتا
یہ ایک طویل شب کی مانند ہے
جس کی وسعت میں
انتظار کی چادر
تن پہ ڈالنے والے کا
نام گونجتا ہے

جہاں آرا تبسم

وراثت

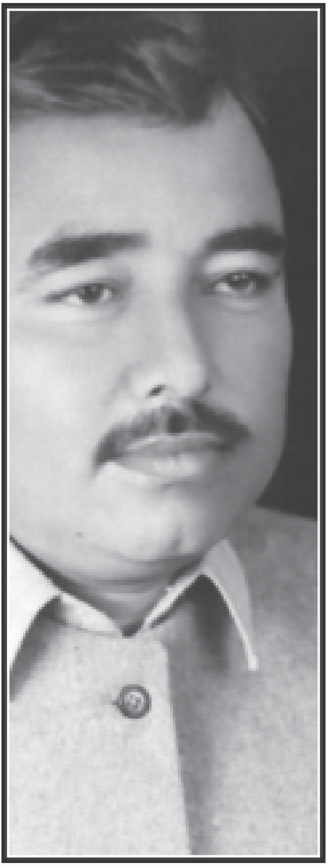

وراثت میں آتا ہے کردار بھی

وراثت میں فطرت بھی اخلاق بھی

یہ نس نس کے ملنا روابط بھی

ملنسار انداز بھی فطرتی

اسی میں سے ہے ظرف بھی ایک جز

فقط کارخانے پلازے کہاں

فقط گھر حویلی زمینیں کہاں

وراثت کے معنی تو سمجھا نہیں

عاصم بخاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر ہاتھ پہ دھر دیتے ہیں عمروں کا تحیر
یہ لوگ تو آنکھیں بھی چرانے نہیں دیتے

یادوں کا پھندا

یہ کیسی گھٹن ہے جو دل میں بسی ہے؟
یہ کیسی اداسی جو پلکوں پہ آئی ہوئی ہے؟
یہ زخموں کے سائے، یہ یادوں کی زنجیر جاناں
کہ جیسے وہ سانسوں پہ چلتی کٹاریں
یہ کمرہ ہے سونا، یہ دیوار چپ ہے
یہ لرزیدہ سائے، یہ خاموش لمحے
یہ بوسیدہ سانسیں، یہ ٹھنڈی ہوائیں
یہ آنکھوں میں ٹھہری ہوئی بے بسی ہے
یہ لمحوں کا پھندہ، یہ گردن کی لرزش
یہ سانسوں کے دریا میں بہتی اُداسی
میں روتا نہیں ہوں
مگر یہ اذیت مجھے کاٹتی ہے
سبھی الجھنوں کا میں پھندہ بنا کر
جو چاہوں کہ لٹکوں
مگر ہچکچاہٹ قدم روکتی ہے
کہ ہنستے ہوئے چار چہرے پکاریں گے مجھ کو
کبھی سوچ کر میں پلٹتا ہوں اکثر
یہ اس کی رضا ہے
مگر اب کروں کیا
کہ مرنا گناہ اور جینا سزا ہے

تصدق فرید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

نئی گھڑی ، نئے صحرا نئے اُفق لائی
کسی طرح حقِ آشفتگی ادا بھی تو ہو

مطلبی منافق

بل گیٹس ایلون مسک امبانی

گولڈسمتھ ٹاٹا برلا، ادم جی اصفہانی

اور بہت سے

سب خاموش ہیں

بس غزہ چیخ رہا ہے

بچوں کو

پولیو، خناق، خسرہ یرقان سے بچانے

کے لیے رقم میسر ہے

تعلیمی گراف کو اُوپر لے جانے

کے لیے فنڈ موجود ہے

مگر غزہ کے معصوم بچوں کے لیے

فنڈ تو کیا تسلی کے دو حرف بھی نہیں

سراب در سراب گھومنے والے

انسٹا گرام ٹویٹر

فیس بک ٹک ٹاک

اور قریب ترین صحرا واٹ ایپ میں

تم مجھ سے مل سکتے ہو

مگر تم مجھے پہچان نہیں پاؤ گے

کہ مجھ جیسے لاکھوں

ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنے کے لیے

صحرا صحرا بھٹک رہے ہیں

مگر اپنے دروازے پر ہونے والی دستک

پر کان نہیں دھرتے

بات نہیں کرتے

بس صحرا صحرا بے چین پھرتے ہیں

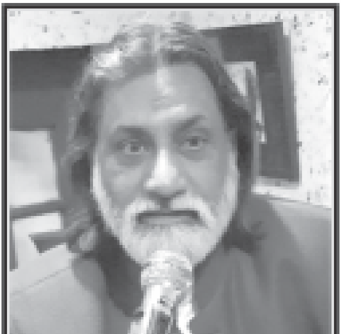

اعجاز رضوی

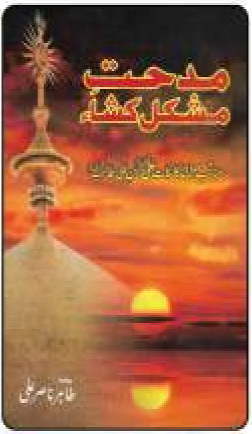
مدحت
مشعل کشا

دیپک
کلیات
رخشندہ نوید

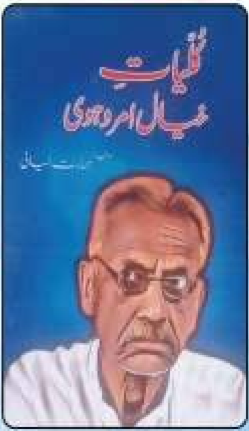
کلیاتِ
عیال امروہوی

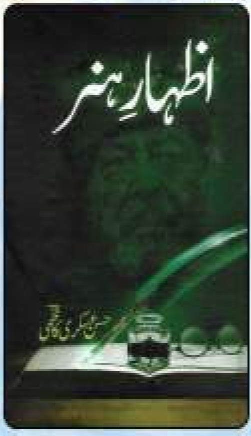
اظہارِ ہنر

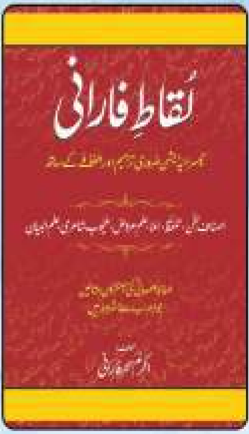
نقاطِ فارانی

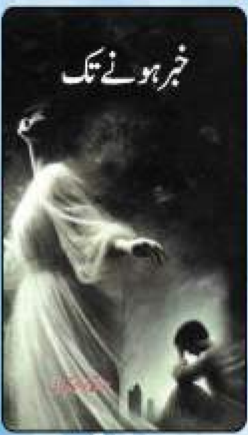
خبر ہونے تک

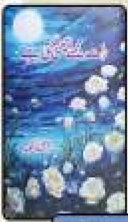

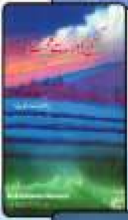

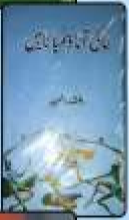

محترمہ بانو قدسیہ، محترمہ رخشندہ نوید

محترمہ رخشندہ نوید، جناب خالد احمد، جناب نجیب احمد

جناب عطاالحق قاسمی، جناب خورشید رضوی، محترمہ رخشندہ نوید

محترمہ رخشندہ نوید، جناب امجد اسلام امجد

محترمہ رخشندہ نوید، جناب خالد احمد، محترمہ فرحت پروین، جناب
امجد اسلام امجد، جناب اعجاز رضوی، جناب امیر حسین جعفری،
جناب منظر حسین اختر، جناب احمد عقیل روبی، جناب اشرف جاوید

محترمہ رخشندہ نوید پاکستان کے نامور شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ گروپ فوٹو